خوفناک پُراسرار کہانی
راز
sohnidigest.com
رضوان علی سومرو

پُراسرار ناول | رضوان علی سومرو

راز

اس بار بجلی بہت زور سے چمکی تھی۔ بارش بے حد شدید تھی اور گھوڑا گرتے گرتے بچا تھا۔ اس کے ساتھ ہوا اور رات کا اندھیرا۔

وہ ایک طوفانی رات تھی مگر وہ گھوڑا بھی شاید کسی طوفان سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے سوار کو اس طرح اُڑائے جا رہا تھا جیسے کہ اس ہنگامہ خیز رات کا ایک جز ہو۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔ اندھیرے میں اس طرح فراٹے بھرنے سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ راستہ اس کا جانا پہچانا ہے۔ سوار کی حالت ابتر تھی۔ وہ ایک دس سال کی بچی تھی جو کہ گھوڑے کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کا چہرا اور لباس خون سے بھرا ہوا تھا جبکہ گھوڑا بھی زخمی تھا۔ بچی کے ہاتھ سے لگام کب کی چھوٹ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہیں گر گئی ہو گی ورنہ گھوڑا اس سے ضرور الجھ جاتا۔

سڑک کے دونوں اطراف جنگلات کے سلسلے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کی ایک چمک اس کو چونکا

دیتی پھر وہ اسی گھنے اور اندھیرے شور میں کہیں کھو جاتے۔ گھوڑا جنگل میں گھس پڑا تھا۔ جنگل گھنا اور اندھیرا تھا مگر گھوڑا ایسے دوڑ رہا تھا جیسے کہ اس کو سب نظر آ رہا ہو۔ کافی دیر گھوڑا ایک عمارت کے سامنے رک گیا۔ وہ عمارت لال انٹیوں اور گول پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے صدر دروازے پر دو مشعلیں روشن تھیں۔ مشعلوں کے اوپر ایک بڑا سا شیڈ تھا جس کی وجہ سے وہ بارش میں بھی جل رہی تھیں۔ بارش کا ہیجان اب کم ہو چلا تھا۔ گھوڑا عمارت کے دروازے کے سامنے پوری قوت سے ہنہنایا۔ اس کے حلق سے کربناک آوازیں نکلتی رہیں۔ اچانک برآمدے میں قدموں کی آوازیں گونجیں اور بہت سی مشعلیں نظر آئیں اور پھر بہت سے سیاہ چوغے والے لوگوں نے گھوڑے کو گھیر لیا تھا جن کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ گھوڑے سے حلق سے کربناک آوازیں نکلیں اور پھر اس نے اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔ سیاہ چوغہ والے بچی کی بڑھے ہی تھے ایک گونجیلی آواز سن کر وہ رک گئے۔

"رک جاؤ، کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

سیاہ پوشوں نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی پل وہ الرٹ ہو گئے کیونکہ آنے والا شاید ان کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ نوارد نے سبز اور نیلا چوغہ پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی شکل سے نہایت ہی سلجھا ہوا پر وقار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے آس پاس تھی۔

"کیا ہوا اس کو۔" اس نے بچی کی طرف دیکھ کر پر سکون لہجے میں پوچھا۔ بے ہوش بچی اور مرے ہوئے گھوڑے کو دیکھ کر بھی اس کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"معلوم نہیں۔ لگتا ہے وہ لوگ کامیاب ہو گئے ہیں۔" ایک سیاہ چوغہ والے نے کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" نوارد نے کہا۔

اتنا کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر بچی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا اور دوسرے ہی پل وہ

لڑکی کے بازو کی طرف دیکھ کر چونک پڑا۔اس کے چہرے سے وحشت ظاہر ہونے لگی تھی۔

''اناتھا کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں مقدس سردار۔'' دوسرے نے کہا۔

چند لمحے تک سوچنے کے بعد وہ بولا۔'' لگتا ہے اناتھا کو ان لوگوں نے چھین لیا ہے۔''

''ایسا ہی لگتا ہے۔کہیں ایسا تو نہیں۔اناتھا کو کوئی نقصان۔''

''ناممکن۔وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔'' نوارد نے کہا۔

چند لمحے تک سوچنے کے بعد وہ خلاؤں میں گھورتا ہوا دوبارا گویا ہوا۔

''تم لوگ وید کو بلاؤ میں اس بچی کے تندرست ہونے پر اس کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤں گا۔'' نوارد نے اس بچی کو سیاہ چوغہ والوں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ لوگ اس کی تلاش میں یہاں پہنچ گئے تو۔۔۔'' ایک چوغہ والے نے کہا۔اس کے چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

''ہرگز نہیں۔میں اتنا کمزور بھی نہیں کہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہ کر سکوں۔ایک بار اس بچی کی حفاظت کا بندوبست ہو جائے پھر میں اناتھا کی واپسی کے بارے میں سوچوں گا۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔پھر وہ چاروں اس بچی کو لے کر عمارت کے اندر داخل ہو گئے ۔نوارد باہر ہی کھڑا رہا تھا۔بارش اب کم ہو چلی تھی۔اچانک وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''تمہارا حصول ہی میری زندگی کا اہم مقصد ہے۔میں تو زندہ بھی تمہاری ہی وجہ سے ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ عمارت کی جانب مڑ گیا۔

اس وفادار بے زبان کی لاش یوں ہی پانی میں بھیگتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

یہ عمارت غیر آباد اور ویران علاقے میں موجود تھی۔

اس عمارت کا نام نادر محل تھا۔ بہت سے لوگ اس کو کھنڈر ولا کے نام سے بھی جانتے تھے۔ یہ ایک بہت پرانی عمارت تھی جس کے بعض حصے ٹوٹ کر کھنڈر میں تبدیل ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود بھی اس کے سالم حصوں تک پہنچنے کے لئے اس کے صدر دروازے کا قفل کھولنا ضروری تھا۔

عمارت برسوں سے خالی پڑی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ اس کے مالکان نے اس کو فروخت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن ہمیشہ کی طرح خریدار یا تو ڈر کر بھاگ جاتا یا پھر مارا جاتا۔ اس کی وجہ شہرت اس کا آسیبی ہونا تھا۔ درجنوں واقعات اس عمارت سے منسوب تھے مگر ایک واقعے نے زیادہ ہی شہرت پائی تھی۔ قریب کوئی پانچ سال پہلے اس کے مالکان نے اس عمارت کو گرا کر ایک پلازہ بنانے کا اعلان کیا اس لئے اس عمارت کو مکمل طور پر منہدم کرنے کا اعلان کیا گیا چنانچہ عمارت کو گرانے کا کام شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے اس کے سالخوردہ زنگ آلود صدر دروازے پر ضربیں لگائی گئیں۔ لیکن دروزہ تھا کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا چنانچہ مزدوروں کو اس کی بیس بائیس فٹ چوڑی دیوار پھاند کر اندر بھیجا گیا تا کہ اندر سے اس دروازے کو توڑا جا سکے۔ جیسے ہی مزدور اندر داخل ہوئے چند لمحوں کے بعد وہ چلاتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ انہوں نے صحن والی دیوار کے سامنے ایک غیر مرئی مخلوق کو دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ عورت تھی یا کیا تھا۔ اس کے بعد مزدور ڈر سے گئے تھے۔ انہوں نے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اچانک پھر لوگوں نے پھر ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ صدر دروازے کی دیواروں میں دراڑ پڑ چکی تھی اور گاڑھا گاڑھا خون ان دیواروں سے رس رہا تھا پھر ایک خطرناک قسم کے قہقہے نے مزدوروں اور ٹھیکیدار کو سر پر پیر رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر جتنی دفعہ یہ عمارت فروخت

کرنے کی کوشش کی گئی یا خریدار بھاگ جاتا یا مارا جاتا تھا۔پھر تھک ہار کرانہوں نے یہ کوشش ترک کردی تھی۔

☆......☆......☆

دن کے بارہ یا ساڑھے بارہ کا عمل رہا ہوگا۔سورج آگ برسا رہا تھا۔گرمی اسقدر شدید تھی کہ انسان توانسان سڑکوں پر بھونکنے والے کتے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

وہ اسوقت اپنے آفس میں بیٹھا ایک فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔آفس کا اے سی خراب تھا۔چھت پر لگے پنکھے سے نکلنے والی گرم ہوا نے پورے کمرے کو جہنم کا نمونہ بنا دیا تھا۔ وہ بار بار اپنے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتا اور پھر دوبارا فائل میں مصروف ہو جاتا۔اس کے چہرے پر شدید قسم کی جھنجلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔تنگ آکر اس نے بیل کا بٹن دبایا۔کچھ ہی دیر بعد ایک پولیس کانسٹیبل آ کھڑا ہو گیا۔اس نے آتے ہی ایک زوردار سیلوٹ جھاڑا۔

''جی سر جی۔''اس نے خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے نہایت غصہ بھری نظروں سے اس کو دیکھا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔

''وہ اے سی والا تیرا پیو ہے جو تو اس کو بلا کر نہیں لایا۔''☆

اس کے چڑھے ہوئے تیور دیکھ کر وہ لجاجت سے بولا۔''حضور! میں گیا تھا مگر اس کی ماں بیمار ہے۔اس لئے وہ شام میں آئے گا۔''

''اوئے۔کم چورا۔کوئی تو ڈھنگ سے کام کر لیا کر،جا میرے لئے لسی لے کر آ۔''وہ غصہ سے بولا۔

''حضور پیسے۔''کانسٹیبل نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

''اوے۔شرم کر کیوں پولیس کو بدنام کرتا ہے پیسے دے کر،جا میرا نام لے۔کہنا انسپکٹر

صاحب نے منگوائی ہے۔"

لسی کے پہلے ہی گھونٹ نے اس کو نہایت فرحت کا احساس بخشا تھا۔لسی پی کر وہ دوبارا فائل میں لگ گیا تھا۔کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ ایک دوسرا کانسٹیبل اندر داخل ہوا۔کانسٹیبل کو اندر آتا دیکھ کر اس کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔

"ہاں غفور بولو۔" اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کو غفور کی آمد اچھی نہیں لگی ہے۔

غفور نے فوراً ہی صاحب کے چڑھے تیور بھانپ لئے اور خوشامدانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔"سر جی، کل جس بندے کو ہم نے ڈکیتی میں اُٹھایا تھا اس کے لواحقین ملنے آئے ہیں آپ سے۔لگتا ہے کوئی مک مکا کرنے کے چکر میں ہیں۔"

مک مکا کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دوڑ گئی۔

"اچھا۔تو بلالے اس میں ایک بندے کو بھیج دینا۔اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

غفور جانے لگا تو اس نے پیچھے سے آواز دی۔"اوئے اس کے علاوہ اور کوئی ملاقات تو نہیں۔"

"نہیں جناب۔" غفور نے خوشامدانہ لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ اندر دبلا پتلا سا ایک شخص اندر داخل ہوا۔اس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور پریشانی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔وہ شخص اجازت لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔اسکی عمر پچاس سال کے آس پاس تھی۔وہ چند لمحے بیٹھا رہا، انسپکٹر اس کی حرکات وسکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔اس نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھے پر آیا پسینہ پونچھنے کے بعد بولا۔

"حضور! میرا نام کریم بخش ہے۔جس لڑکے کو کل رات آپ نے گرفتار کیا ہے میں اس کا باپ ہوں۔وہ بے گناہ ہے جناب۔" کریم بخش گلوگیر لہجے میں بولا۔

”محترم۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ ہر باپ کی نظر میں اس کا بیٹا بے گناہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ اسلحے اور ڈکیتی کے مال کے ساتھ گرفتار ہوا ہے۔“

”وہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہے سر۔ اگر سزا ہوگئی تو اس کا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ اس نے کچھ نہیں کیا نہ معلوم کیسے مال کے ساتھ پکڑا گیا۔ اب آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”کیا کروں۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”میں کیا بتاؤں آپ سمجھدار ہیں۔“ کریم بخش نے مسکرا کر کہا۔

وہ چند لمحے تک سوچتا رہا پھر بولا۔

”بزگوار! بچے کے مستقبل کا سوال ہے اس لئے ایک لاکھ مناسب ہیں۔“

کریم بخش چند لمحات تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

اسکا پورا نام انسپکٹر آصف درگوش تھا۔ ماں، باپ کا انتقال بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ اس کی پرورش کرنے والے اس کے دادا تھے جو کہ ایک شاعر تھے۔ درگوش ان کا تخلص تھا۔ آصف کو یہ تخلص اسقدر پسند تھا کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کے نام کی جگہ تخلص لگانا ہی پسند کیا تھا۔ قانون کی بالادستی کا اس کو ہرگز شوق نہ تھا نہ ہی وہ جرم کو ختم کر دینے کا متمنی تھا۔ پولیس میں جاب کرنے کا مقصد صرف اور صرف پیسہ کمانا تھا۔ اس کی وجہ اس کا بچپن سے لے کر جوانی تک ہر ضرورت کو محدود کرنا اور اسکا گلا گھونٹ دینا تھی۔ ہر غیر قانونی کام جس میں پیسہ ملنے کا چانس ہو درگوش ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس آدمی کے رخصت ہو جانے کے بعد درگوش دوبارا فائل کی ورق گردانی میں لگ گیا تھا۔

نادر محل کی آسیبی شہرت اب بھی برقرار تھی۔اب تو وہاں لوگوں نے آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت نادر محل کے صدر دروازے کے پاس ایک ہائی روف آ کر رکی۔ہائی روف میں چار لوگ سوار تھے۔ان چاروں پر بہترین قسم کے سوٹ تھے لیکن انسان کے جسم پر موجود بہترین سوٹ کبھی بھی اس کے شریف ہونے کی دلیل نہیں۔یہ چاروں بھی شریف بدمعاش تھے۔ان میں سے سب سے پہلے اترنے والے شخص کا نام ناگر تھا۔نام تو اس کا کچھ اور تھا مگر جرم کی دنیا میں اسکو ناگر دادا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ناگر کی عمر دس برس تھی۔ایک روٹی چوری کرنے کے جرم میں لوگوں نے اس کو اتنا مارا کہ اس کے ماتھے پر چوٹ کا ایک گہرا نشان بن گیا جو کہ بعد میں اس کی مستقل شناختی علامت بن گیا۔اس کے بعد ناگر دادا نے سبق سیکھ لیا زندہ رہنے کے لئے دوسروں کا نوالہ چھین کر اپنا پیٹ بھرنا ضروری ہے۔اس کے بعد چھوٹی موٹی چوریوں سے ایک دن وہ بڑا دادا بن گیا تھا۔جیل کی سیر کے بعد اس کے جرائم کو رجسٹریشن بھی مل گئی تھی۔خیر ناگر اب ایک بہت بڑا دادا تھا۔وہ چاروں نادر محل کے صدر دروازے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ایک نے جیب سے تار نما ایک چیز نکالی اور دروازے کے قفل پر جھک گیا۔چند ہی لمحوں کے بعد ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ زنگ آلود تالا کھل گیا تھا۔

صدر دروازے کے اندر داخل ہو کر انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔اب وہ ایک لمبی سی نیم تاریک راہداری میں تھے جو کہ چمگادڑوں اور ابابیلوں کی بدبو سے گونج رہی تھی۔پورے صحن میں جھاڑ جھنکاڑ اور گندگی کے ڈھیر موجود تھے۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سالہا سال یہاں کسی نے قدم نہیں رکھا ہو۔وہ چاروں وحشت زدہ نظر آنے لگے تھے۔اچانک ان میں سے ایک نے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو کہ کھلا ہوا تھا۔اس میں سے نہایت ہی ٹھنڈی ہواؤں کے

جھونکے آتے محسوس ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اے سی چلا دیا ہو۔ ناگر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور سب سے پہلے اس کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے چونک کر ایک دوسرے کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ جو کچھ بھی انہیں نظر آیا تھا وہ ان کی توقعات کے برخلاف تھا۔ کمرے کی صاف ستھری فضا نے ان کو متحیر کر دیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کمرا پورے محل کی طرح گرد وغبار اور مٹی سے اٹا ہوا ہوگا مگر کمرا انہایت صاف ستھرا اور ٹھنڈا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک چمکدار سی میز بچھی ہوئی تھی۔ میز پر جو چیز موجود تھی اس کو دیکھ کر ان کے تینوں کے چہروں پر خوف نظر آنے لگا تھا جبکہ ناگر کے ہونٹوں پر حقارت بھری مسکراہٹ تھی جیسے نظر آنے والی چیز اس کے لیے بے وقعت ہو اور حقیر ہو۔

وہ ایک کھوپڑی تھی جس کو دیکھ کر ان تینوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ سفید دانتوں کی چمکدار قطار بڑی ہی بھیانک لگ رہی تھی۔ اچانک ایک عجیب سی آواز کھوپڑی سے برآمد ہوئی تھی جیسے کہ بھاپ سے چلنے والے انجن نے اسٹیم چھوڑی ہو۔ اس کے بعد اس پراسرار کھوپڑی نے گول گول گھومنا شروع کر دیا۔ وہ کھوپڑی بڑی ہی تیزی سے دائرے میں گھوم رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ان تینوں کے حلق سے چیخیں نکلیں اور وہ گرتے پڑتے بھاگ نکلے لیکن ناگر اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ بڑی ہی دلچسپی سے کھوپڑی کو گھومتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک عجیب سی آواز سن کر وہ چونک پڑا تھا۔

☆......☆......☆

درگوش کو گشت سے واپس آئے آدھا ہی گھنٹہ ہوا تھا کہ کانسٹیبل شیدے جس کا نام شیر علی تھا لیکن اس کو تھانے میں پیار سے شیدا کہا جاتا تھا اس نے ایک زبردست قسم کا سیلوٹ جھاڑ دیا

تھا۔ درگوش نے تیوری چڑھا کر اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

''بولو کیا بات ہے۔''

''حضور آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے وہ۔'' درگوش نے سیٹ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔ وہ اپنا نام مراد بتاتا ہے اور بہت دیر سے بیٹھا ہے۔'' شیدے نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''ملنے کی وجہ۔''

''یہ تو معلوم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ سے کوئی ذاتی کام ہے۔''

اس کی بات سن کر درگوش سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے اس کی جامہ تلاشی لے کر اندر بھیج دو۔''

''جی۔ حضور۔ شیدا پھرتی سے گھوم گیا۔

اب اس کا رخ رپورٹنگ روم کی طرف تھا جہاں اس وقت ہیڈ محرر کے پاس لوگ موجود تھے اور وہ اپنے نرم گرم انداز میں ایف آئی آر لکھنے میں مصروف تھا۔

شیدے نے ہیڈ محرر پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ یہاں ایک خالی بینچ پر مراد نامی آدمی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور ایک موٹی سی شال جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

اس کے جسم پر شال دیکھ کر شیدے نے حیرت سے سوچا اس قدر گرمی میں چادر۔

''اوئے۔ یہ چادر اتار کر یہاں رکھ دو۔'' شیدے نے اپنے مخصوص پولیس والے انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' مراد نامی آدمی حیرت سے بولا۔

مراد جسامت میں کوئی چھ فٹ کا دبلا پتلا آدمی تھا۔اس کی رنگت سانولی اور چہرے پر گھنی مونچھیں کافی جچ رہی تھیں۔

''اوئے۔جتنا کہا ہے اتنا کر۔صاحب سے نے بلایا تیری تلاشی کے بغیر تو مل نہیں سکتا ان سے۔'' شیدے نے غصہ سے کہا۔

''مگر چادر کیوں اتاروں۔'' مراد اب بھی حیرت زدہ تھا۔

''اوئے۔تو شرافت کی زبان سمجھتا نہیں ہے۔چادر اتار اور تلاشی دے بس۔''

اس کی بات سن کر مراد نے بادل نخواستہ چادر اتاری اور بینچ پر رکھ دی۔

''مم۔مجھے بخار ہے اور سردی لگ رہی تھی اس لئے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔''

''واپس آ کر اوڑھ لینا۔'' شیدے نے ہمدردی سے کہا۔اس نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی اور اس کو ساتھ لے کر درگوش کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔جلد ہی مراد انسپکٹر درگوش کے سامنے موجود تھا۔چند لمحوں تک وہ درگوش اس کا جائزہ لیتا اور پھر پر تفکر انداز میں اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیٹھو۔کون ہو تم۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر یوں لگا کہ جیسے کہ وہ اپنے دماغ میں الفاظ کا ذخیرہ جمع کر رہا ہو۔

اسی دوران درگوش اس کے چہرے کو یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے پوسٹ مارٹم کر رہا ہو۔

''بولو۔خاموش کیوں ہو۔'' درگوش نے سخت لہجے میں کہا۔

''بات یہ ہے۔جناب میں آپ کے لئے بڑے سرکار کا پیغام لے کر آیا ہوں۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

”کون بڑے سرکار جن کا پیغام تم لے کر آئے ہو۔“

”وہ ہمارے گاؤں کے سردار ہیں جناب۔“ مراد نے بتایا۔ ”ان کے ایک اہم آدمی کو اغوا کرلیا گیا ہے اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہتے ہیں۔“

”کونسا۔ گاؤں ہے تمہارا۔“

”دیونگر۔“

”ہوں۔“ سر ہلا کر جواب دیا گیا تھا۔ ”اگر بندہ اغوا ہوا ہے تو ہیڈ محرر کے پاس رپٹ لکھواؤ میں کیا کرسکتا ہوں۔“

”رپٹ تو لکھوائی جا چکی ہے۔ جناب مگر ان چیزوں سے کیا فائدہ جناب بڑے سرکار آپ سے ذاتی طور پر مدد کے خواہاں ہیں۔“ مراد معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

اس کی مسکراہٹ کا مطلب درگوش فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ ذاتی طور پر مدد کا مطلب ایک بڑی رشوت ہی ہوسکتا تھا۔

”بڑے سرکار نے آپ کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔“ مراد نے مسکرا کر کہا۔

”دعوت۔“

”جی ہاں۔ جناب۔“

”اپنے بڑے سرکار کو بولو یہاں آجائے۔“ درگوش نے افسرانہ انداز میں کہا۔

”جناب! بڑے سرکار نے کہا ہے کہ آپ کا ہی فائدہ ہے۔ کھانا تو ملے گا ہی اور ساتھ میں کھیر بھی۔“ مراد کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا۔

کھیر کی بات سن کر درگوش کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ اس چمک کو مراد نے اچھی طرح سے محسوس کرلیا اور مسکرانے لگا۔ قدرے توقف کے بعد وہ دوبارا گویا ہوا۔

"جناب۔ جب ملیں گے تو اور بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔ بس انہوں نے اتنا سا پیغام دے کر بھیجا ہے۔"

مراد کی بات سن کر درگوش سوچ میں پڑ گیا تھا۔ بڑے سرکار کا یوں بلانا بے مقصد تو ہو نہیں سکتا تھا۔ ضرور بڑے سرکار کے ہاتھ کسی جرم میں ملوث ہیں۔ چند لمحے تک وہ سوچنے کے بعد بولا۔ "یہ دیونگر کس طرف ہے۔"

☆......☆......☆

وہ ایک عجیب سی آواز تھی جس کو سن کر ناگر چونک پڑا تھا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہو۔ ناگر نے چونک کر اس ناچتی ہوئی کھوپڑی کو دیکھا اور بڑی ہی بے پروائی سے گردن جھٹک کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوسرے لمحے اس کو پکڑ لیا تھا۔ اس نے کھوپڑی کے نچلے حصہ کو اپنی طرف کر لیا تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے پہیے بڑی ہی تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ اسی سے خارج ہو رہی تھی۔

ناگر کے لبوں پر حقارت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پہیوں کی گردش رک گئی۔ ناگر نے کھوپڑی کو اسی جگہ چھوڑا اور پورے محل میں وہ چکراتا پھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناگر جب دوبارہ اسی جگہ پہنچا تو نہ وہاں کھوپڑی تھی اور نہ ہی وہ میز۔ ناگر نے لاپروائی سے گردن جھٹکی اور پھر محل سے باہر آ گیا۔ کار میں اس کے تینوں ساتھی موجود تھے جن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ محل بھوتیا ہے۔" ایک نے کہا۔

"تو۔" ناگر نے اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم وہاں کرنے کیا گئے تھے۔" دوسرا ساتھی بولا۔

”کچھ نہیں۔بس ایک فون آیا تھا جس کی وجہ سے میں دوڑا چلا آیا۔“

”ایک فون پر۔“ تیسرے ساتھی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں تو اچھے پیسوں کی امید پر وہاں گیا تھا تم لوگ جانتے ہو۔پولیس کی کتنی سخت چیکنگ ہے۔پکڑ دھکڑ کے اس زمانے میں اس فون سے سمجھا شاید بڑی رقم کا آسرا ہو جائے۔“

ایک ساتھی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ناگر کا موبائل بجنے لگا تھا۔ناگر نے چونک کر فون اُٹھا لیا۔یہ وہی نمبر تھا جس پر پہلے بھی اس کو کال آئی تھی۔

”میں تم سے بہت خوش ہوں ناگر۔تم اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ڈرپوک نہیں ہو۔مجھے تم پسند آئے۔میرے اس کام کے لئے تم سے بہتر آدمی کوئی ہو نہیں سکتا۔“ ناگر کو سنائی دینے والی آواز نہایت قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔آواز سن کر ناگر کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔اس نے اپنے جسم میں کپکپی دوڑتی ہوئی واضح محسوس کی تھی۔اس کو یوں لگا تھا کہ جیسے ویرانے میں کوئی بھیڑیا غرایا ہو۔

”مم۔میں۔مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ ناگر کے سہمے ہوئے لہجے کو دیکھ کر اس کے ساتھی چونک گئے۔انہوں نے اس کے لہجے میں خوف کے عنصر کو صاف محسوس کیا تھا۔

”کچھ نہیں۔بس آرام کرو۔اور میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔اور ہاں بیس ہزار کی رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں کریڈٹ کر دی گئی ہے۔“

☆......☆......☆

دیونگر ایک چھوٹا سا مگر انتہائی خوبصورت گاؤں تھا۔چاروں طرف قدرتی ہریالی سے بھرپور یہ گاؤں اپنے اندر ایک الگ ہی کشش لئے ہوئے تھا۔درگوش جب چار گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد دیونگر میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ شیدا بھی تھا۔شیدا بڑے ہی پرسکون انداز

میں جیپ چلا رہا تھا۔ یہ جیپ درگوش کی اپنی تھی۔

''مراد نے تو کہا تھا کہ دیونگر میں ہم کو لینے آئے گا۔'' درگوش نے شیدے سے کہا۔

''حضور! وہ سامنے دیکھیں۔'' شیدے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جیپ روک دی۔

درگوش نے سامنے دیکھا تو درختوں کے جھنڈ کے درمیان مراد کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اس نے آج بھی وہی چادر اپنے جسم پر اوڑھ رکھی تھی۔

جیپ رکتے دیکھ کر مراد تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ جہاں جیپ رکی تھی وہ علاقہ زیادہ گنجان آباد نہ تھا۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک سڑک اندر کی طرف جا رہی تھی۔

''حضور! یہ خاکسار گھنٹے بھر سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

''وہ کیوں۔'' درگوش نے چونک کر پوچھا۔

''بڑے سرکار کا حکم تھا ناں۔ آپ آئیں یا نہ آئیں آپ کی راہ تو دیکھنی ہے۔''

''کہاں چلنا ہے۔''

مراد نے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ جیپ میں سوار ہو گئے اور جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔ قدرتی نظارے کھیت کلیان درگوش کو بہت متاثر کر رہے تھے۔ کافی دیر کے سفر کے بعد جیپ کچے پکے مکانوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ایک لال رنگ کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ لال رنگ کی عمارت طرز تعمیر کے حساب سے کافی پرانی تھی جس کو دیکھ کر درگوش کو مغل دور کی عمارتیں یاد آگئیں۔

''کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا۔'' شیدے نے سرگوشی کی۔

''خطرہ کیسا۔ دعوت ہے کھانا کھاؤ اور نکلو۔'' درگوش کے انداز میں لاپروائی تھی۔

تینوں دروازے پر پہنچے اور دروازہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ جلد ہی وہ مراد کے اشارے

پر اس کے نقش قدم پر چلتے رہے تھے۔

یہ کھلا صحن تھا جس کے اطراف میں درختوں کی بہتات تھی۔ درگوش نے اپنی تیز آنکھوں سے اس کنویں کو بھی دیکھ لیا تھا جس کے گرد کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ڈول سے پانی نکال رہا تھا۔ یہ سارے مناظر درگوش کو کئی سال پیچھے لے گئے تھے۔ دیہی زندگی میں آج بھی یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔

درگوش کو کچھ لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ یہ سب سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

حویلی نما یہ مکان کافی بڑا تھا۔ مراد ان کو لے کر ایک خالی کمرے میں چلا آیا تھا جہاں قرینے سے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور کونوں پر گاؤ تکیے ٹکائے گئے تھے۔

"آپ لوگ تشریف رکھیں میں بڑے سرکار کو خبر کرتا ہوں۔" مراد نے ادب سے کہا اور باہر نکل گیا۔ شیدا پورے کمرے کی ایک ایک چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ درگوش نے اس کی آنکھوں میں پر جوش کیفیت دیکھی۔

"اوئے۔ کیا بات ہے تم ہر چیز کو بڑے ہی غور سے دیکھ رہے ہو۔"

"حضور! یہ تو مجرے کا سماں ہے۔"

"شیر علی۔ تم بہت شوقین لگتے ہو۔ ان چیزوں کے۔" درگوش شیدا کو گھور کر دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے یوں گھور کر دیکھنے سے شیدا گڑ بڑا گیا۔

"نہیں حضور۔ بات یہ ہے کہ آپ سے پہلے جو تھانیدار صاحب تھے ان کے ساتھ بلبل ہزار داستان کے بہت چھاپے مارے ہیں۔"

"بلبل ہزار داستان۔" درگوش چونک گیا۔

''سرجی۔طوائفوں کے کوٹھوں کو بلبل ہزار داستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔وہ کہتے ہیں ناں کہ ہر بلبل کی الگ کہانی ہوتی ہے اس لئے۔''شیدے نے بھرپور انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔''اس نے سرہلایا۔''لگتا ہے تمہاری ان بلبلوں سے بہت واقفیت ہے۔''

اس کی بات سن کر شیدا کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''حضور اب ایسا بھی نہیں ہے۔''

''خیر کوئی بات نہیں۔کسی وقت ان بلبلوں کا چہکنا بھی سنیں گے۔''درگوش مسکرایا۔

''بالکل جناب،اب تو یہ کاروبار اس لاک ڈاؤن میں اور منافع بخش ہوگیا ہے۔''

''گڈ۔''درگوش کچھ سوچ کر بولا۔وہاں بھی چلیں گے۔ذرا صبر کرو۔''

شیدا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کمرے میں اندر داخل ہونے والے شخص کو دیکھ کر درگوش رعب میں مبتلا ہوگیا۔آنے والا شخص ایک بوڑھا مگر بارعب انسان تھا جس کے سر اور داڑھی کے سارے بال سفید ہوچکے تھے۔سر کے بال زلفوں کی طرح کندھے پر پھیلے ہوئے تھے۔وہ بوڑھا شخص نہایت کمزور اور مدقوق تھا۔اس کی پوری شخصیت میں اس کی آنکھیں ہی تھیں جن کو دیکھ کر سامنے وال بندہ از خود رعب میں مبتلا ہوجاتا۔اس کو دیکھ کر درگوش اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا۔جس کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگا تھا۔

''بیٹھو،بیٹھو بابا۔ہمیں یوں شرمندہ نہ کرو۔''اس کی آواز اس کی شخصیت کی طرح پر رعب تھی۔اس کی بات پر درگوش فوراََ ہی بیٹھ گیا تھا۔وہ درگوش کی جانب دیکھ کر پھر گویا ہوا۔

''ہمیں بڑے سرکار کہتے ہیں۔نام تو ماں باپ نے کچھ اور رکھا تھا لیکن لوگ محبت اور احترام میں بڑے سرکار کہتے ہیں۔''

درگوش نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس وہ تو اس کی شخصیت کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ نہ جانے کیوں اس کو ایسا لگا کہ بڑے سرکار اندر سے کچھ اور ہیں۔ مراد کسی زرخرید غلام کی طرح دروازے پر ہی کھڑا تھا۔

"مراد، جاؤ بابا۔ معزز مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کرو۔"

مراد کسی جن کی طرح اڑنچھو ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بڑے سرکار نے بڑی ہی گہری نظروں سے درگوش کی جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بابا تمہارا بہت بہت شکریہ، تم ہمارے بلانے پر تشریف لائے۔ اس لئے ہم خود تمہارا استقبال کرنے آ گئے۔"

"بلانے کی کوئی خاص وجہ۔"

"ایسی کوئی خاص وجہ نہیں ہم تو بس آپ کے نیاز چاہتے تھے۔ باقی باتیں تو کھانے کے بعد ہوتی ہی رہیں گی۔"

درگوش بے اعتنائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

☆......☆......☆

وہی پراسرار آواز ناگر کو پھر سنائی دی تھی جس کو سن کر اس کو اپنے جسم میں کپکپی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ یہ اس روز کی بات ہے جب بیس ہزار کی رقم اس کو ملے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اس نے اس رقم میں سے دس ہزار روپے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ اس کے بعد باقی رقم ختم ہونے میں اس کو دو دن بھی نہ لگے تھے۔ اچانک اس کو وہی فون موصول ہوا تھا۔ جب وہ ایک بار میں شراب کے نشے میں دھت پڑا تھا۔ فون پر نمبر دیکھتے ہی اس کا نشہ اڑنچھو ہو گیا تھا۔ اس آواز نے جو کچھ کہا اس کو سن کر اس کے ہوش خطا ہو گئے۔

"یہ تو بہت خطرے والا کام ہے۔"

"کام ضرور خطرے والا ہے مگر اس کا انعام بھی بہت تگڑا ہے۔ اس جیولری شاپ میں کم سے کم دو کروڑ روپے کے ہیرے موجود ہیں۔ جس کو چرانے کے بعد تم چاروں کو دس لاکھ ملے گا اور وہ رقم تم پورا سال بیٹھ کر کھا سکتے ہو۔"

دس لاکھ کا سن کر نا گر کے منہ میں پانی سا آ گیا تھا اور پھر اس نے ہامی بھر لی تھی۔ دس لاکھ کی رقم کچھ معمولی نہ تھی۔ اس آواز نے یہ بھی کہا تھا کہ جو بھی خطرہ ہو گا وہ خود نمٹ لے گا تم کو جا کر بس لوٹنا ہے۔

☆......☆......☆

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بڑے سرکار نے درگوش کی دعوت میں کسی بھی قسم کی کوئی کسر چھوڑی ہو۔ کئی طرح کے چکن کے سالن تھے اور کئی طرح کے بیف اور پھر بریانی، پلاؤ اور بہت۔ کچھ بڑے سرکار خود ہی کئی ڈشیں آگے بڑھا رہے تھے۔ درگوش نے خود بھی کھانے سے پوری طرح سے انصاف کیا تھا اور شیدا تو کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑا تھا کہ اس نے یہ سب پہلی بار دیکھا ہو۔

بہت جلد درگوش نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور مسکرا کر بولا۔ "بس بڑے سرکار پیٹ بھر گیا لیکن نیت نہیں بھری۔"

اس کی بات سن کر بڑے سرکار کے حلق سے طویل قہقہہ آزاد ہو گیا۔

"چلو۔ پھر بابا ہم آپ کا کھانا ہضم کرا دیتے ہیں۔ ذرا باہر چل کر ٹہل آتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں کھلی جگہ آ گئے تھے جہاں پانی کا کنواں تھا۔ درگوش نے بڑے سرکار کی طرف دیکھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا ہونے والا ہی تھا۔ اس دھندلی روشنی

میں وہ بڑے سرکار کے ماتھے کی شکنیں صاف دیکھ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' درگوش نے کہا۔

''کچھ نہیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ مطلب کی بات پر آجائیں۔کوئی بھی بنا مطلب کسی بھی دعوت نہیں کرتا۔''

اس کی بات سن کر بڑے سرکار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

''برخوردار۔ مجھے ایسے ہی صاف گو لوگ پسند ہیں۔میرا ایک آدمی پولیس کی حراست میں ہے۔اس پر قتل کا جرم پولیس نے ثابت کر دیا ہے۔اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرے آدمی کو بچانے میں میری مدد کرو۔''

''کون سا آدمی؟'' درگوش چونکا۔

''ہاشم۔ہاشم خان دارا۔'' بڑے سرکار نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ۔ہاشم آپ کا آدمی ہے۔جس پر ایک عورت کی آبروریزی اور قتل کا الزام ہے۔''

''ہاں وہ میرا خاص شاگرد ہے۔''

''اس کو میرے خیال سے انسپکٹر جبران نے موقع سے گرفتار کیا تھا۔'' درگوش نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔تمہارے اس ASI پر فرض شناسی کا بھوت سوار ہے۔'' بڑے سرکار نے ناگواری سے جواب دیا۔''میں جانتا ہوں تم میرے آدمی کی مدد ضرور کرو گے۔'' بڑے سرکار نے توقف کے بعد کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے اس پر دفعہ تین سو دو ثابت ہو چکا ہے۔جج اگلے ہفتے سزا بھی سنا دے گا۔''

”ضرور سنا دے گا۔لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ پولیس نے ابھی تک آلہ قتل عدالت میں پیش نہیں کیا ہے۔“بڑے سرکار نے مسکرا کر کہا۔

”کیا میں یہ سمجھوں کہ بڑے سرکار مجرموں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ایک سفاک قاتل کا چھوٹ جانا معاشرے کے لئے کتنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔“

اس کی بات سن کر بڑے سرکار کے حلق سے ایک طویل قہقہہ آزاد ہوگیا۔

”ارے آفیسر، مجرم کون نہیں ہے تم میں۔ یہ پورا معاشرہ جس کو جہاں موقع ملتا ہے وہ جرم کر جاتا ہے۔اپنی مثال لے لو تم کیا صاف ستھرے آفیسر ہو۔“

اس کی بات سن کر درگوش خاموش ہوگیا۔اس کی زندگی کا مقصد پیسہ کمانا تھا۔اس کو معاشرے سے کیا لینا دینا۔

”پانچ لاکھ لگے گا۔“اس نے چند لمحے تک سوچنے کے بعد کہا۔

”منظور۔“بڑے سرکار نے کہا۔

”پھر تو میری طرف سے ڈن ہے۔“

اسی لمحے درگوش کی آنکھوں میں یکدم روشنی سی بھر گئی۔وہ بس مبہوت ہوکر اسی کو دیکھنے لگا تھا۔وہ لال آنکھوں والا سفید بے داغ خرگوش تھا جو نہ جانے کہاں سے بھاگتا ہوا اسی طرف نکل آیا تھا۔اس کے تعاقب میں ایک لڑکی تھی جس کو دیکھ کر درگوش مبہوت ہوکر رہ گیا۔وہ شاعر تو نہ تھا مگر اس کو دیکھ کر اس موقع پر اس کے دماغ میں ایک شعر گونجا تھا۔جو کہ موقع کی مناسبت سے کافی جچ رہا تھا۔

”اف مرمر سے تراشا ہوا وہ شفاف بدن
دیکھنے والے اس کو تاج محل کہتے ہیں“

درگوش نے بس اسکو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔اتنی خوبصورت اور حسین لڑکی اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ایک عجیب سی معصومیت اور پراسراریت تھی اس کے چہرے پر۔بس وہ اس کو محویت سے گھورتا ہی رہ گیا تھا۔لال رنگ کے شلوار سوٹ میں تو قیامت ڈھا رہی تھی۔

لڑکی بھی درگوش کو محویت سے تک رہی تھی۔ یہ نگاہوں کا ہی تصادم تھا جس نے درگوش کو دیوانہ کردیا تھا۔اس نے اپنے دل میں اس کے لئے ایک جذبہ کو محسوس کیا تھا۔اس کی محویت کو بڑے سرکار نے بھی محسوس کرلیا تھا۔وہ بھنا کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوگیا اور غصہ سے بولا۔

''طوسیہ۔''

''بابا جی۔''لڑکی یوں چونکی جیسے اچانک ہی ہوش میں آئی ہو۔

درگوش نے فوراً ہی نظریں چرالی تھیں۔لڑکی کے چہرے پر بھی کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''میں نے تم سے لاکھ بار کہا ہے کہ اس خرگوش کو پنجرے سے مت نکالا کرو۔''

اس کی بات سن کر طوسیہ نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔''خیال رکھوں گی بابا۔''

اتنا کہہ کر وہ پھر اس کے تعاقب میں لگ گئی تھی۔خرگوش آگے بھاگ رہا تھا اور طوسیہ اس کے پیچھے تھی۔ یہ منظر آصف درگوش کو بہت بھلا لگا تھا۔گھر آکر بھی درگوش بس اس کے ہی بارے میں سوچتا رہا تھا۔نیند کی دیوی کب اس پر مہربان ہوئی اس کو پتہ ہی نہ چلا۔رات کے نہ جانے کس پہر اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔دوتین بیلوں کے بعد اس نے فون اُٹھایا۔فون پر جو اطلاع ملی تھی اس کو سن کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

فرض شناسی اور دیانت داری جیسے جراثیم اب پولیس میں بہت ہی ناپید ہو گئے ہیں۔اب چند ہی پولیس آفیسر بچے ہیں جو کہ ایمانداری اور دیانت داری کی مثال ہیں۔ان میں ASI جبران بھی تھا جو اپنی ایمانداری کے سبب آج تک ترقی نہ کر پایا تھا۔اس کا اس کو شکوہ بھی نہ تھا۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ ایک ایسے مولوی کا بیٹا ہے جو پوری زندگی خود بھی حرام سے بچا رہا اور اپنے بچوں کو بھی رزق حلال کی ترغیب دی۔ چنانچہ وہ اسی میں ہی خوش تھا۔

اکثر و بیشتر اس کی رات کی ڈیوٹی ہی لگائی جاتی تھی جس میں زیادہ تر گشت پر ہی رہتا تھا کیونکہ رات میں زیادہ جرائم سے واسطہ ہی پڑتا رہتا تھا۔

حسب معمول وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ موبائل پر گشت پر تھا۔رات کے دو بج چکے تھے۔سردی کی شدت میں اضافہ ہو چلا تھا۔موبائل خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی۔

''لعنت ہے یار رات کی ڈیوٹی پر۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل نے جھلا کر کہا۔

''کیوں کرم دین، آج بہت مرچیں چبا رہے ہو۔'' جبران مسکرا کر بولا۔

''نہیں سر، ایسی بات نہیں ہے۔ چھ ماہ ہوئے ہیں شادی کو اور پورے ایک ماہ سے رات کی ڈیوٹی پر ہوں۔''

''تو پھر کام تو کام ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر۔شادی کے چند سال انجوائے کے ہوتے ہیں اور ان سرد راتوں میں رات کی ''ڈیوٹیاں۔''

''کوئی بات نہیں کرم دین، اگلے ہفتے تم پھر مارننگ میں چلے جاؤ گے۔''

''سر، ان اوپر والوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے جو اُٹھانے میں ماسٹر ہے اوپر والے اسی کی

سنتے ہیں۔" کرم دین غصہ میں بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں، کسی ہوٹل چل کر گرم چائے سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور۔" ابھی یہ جملے اس کے منہ ہیں ہی تھے کہ عین اسی وقت موبائل کے ٹرانس میٹر پر ایک پیغام موصول ہوا۔

"ٹو فور فائیو سکس۔ کالنگ۔"

جبران آگے جھک آیا۔

"سب انسپکٹر جبران ریسیونگ۔"

"آٹھ سو تیرہ نمبر۔" پوچھا گیا

"لیس اوور۔"

"تم لوگ مارٹن روڈ پر ہو۔"

"جی۔ اوور۔"

"ہمارے پاس نامعلوم فون کال سے اطلاع آئی ہے۔ اس کا نمبر ٹریس نہیں ہو پا رہا ہے۔ لگتا ہے فون کرنے والا اپنا ذاتی ایکسچینج رکھتا ہے۔ ممکن ہے خبر غلط بھی ہو۔ لیکن رسک نہیں لے سکتے۔ اوور۔"

"اطلاع کیا ہے۔ اوور۔"

"چند نامعلوم لوگ گولڈ بازار میں موجود ایک دکان کے تالے توڑنے میں مصروف ہیں۔ تم فوراً دیکھو کیا معاملہ ہے۔ اوور۔"

"فون کرنے والے کی آواز کس قسم کی تھی۔ اوور؟"

"مطلب۔"

"آپ نے آواز سن کر کچھ تو اندازہ لگایا ہوگا کہ لہجہ سنجیدہ تھا یا کوئی مذاق کر رہا تھا۔ اوور۔"

”نہیں آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی جس کو سن کر بندہ خوف زدہ ہو جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آواز بنا کر بول رہا تھا۔اوور۔“

اس کی بات سن کر جبران سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحات کے بعد وہ بولا۔

”اچھا ہم دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے۔اوور اینڈ آل۔“

گاڑی اب گولڈ بازار کی جانب مڑ گئی تھی۔ جبران کے چہرے پر تشویش کے گہرے آثار تھے۔ مارٹن روڈ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں کی گولڈ مارکیٹ پچھلی ہی گلی میں تھی جہاں قطار در قطار سناروں کی دکانیں تھیں۔اس وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مین روڈ پر آتے ہی جبران نے موبائل روکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے موبائل کونے میں لا کر روک دی تھی۔ وہ موبائل سے نیچے اترا اور اپنا ریوالور سنبھال لیا تھا اور ساتھی پولیس والوں کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ جلد ہی پولیس والوں کا یہ قافلہ نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔ گلی کے کونے پر پہنچ کر اس نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے ذرا جھک کر ادھر کا معائنہ کیا۔

گلی تاریک تھی البتہ چاند کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا تین سائے ایک دکان کے سامنے موجود ہیں اور جھک کر کسی قسم کی کارروائی میں مصروف ہیں۔ جبران نے دیکھا کہ ان میں ایک اور شخص بھی موجود تھا جو کہ ان تینوں سے ہٹ کر چاروں طرف نظریں دوڑا رہا ہے۔ وہ چوتھا آدمی ناگر تھا جس نے تالے توڑنے کا کام اپنے ساتھیوں کو دیا تھا اور باقی سڑک کی نگرانی کرنے میں خود ہی مصروف تھا۔ جبران نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے فضا میں دو ہوائی فائر مار دیے۔ فائر کی آواز سے ان سایوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔

”رک جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔تم لوگ پولیس کے گھیرے میں ہو۔“ جبران کی

آواز سناٹے کو چیر رہی تھی۔

وہ سائے اسی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ ناگر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس پراسرار آواز نے تو کہا تھا ہر قسم کی ذمہ داری میری ہے۔ ناگر کی آنکھوں کے سامنے جیل کی سلاخیں گھومنے لگی تھیں۔ جبران اپنے ساتھی پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تھا۔ اچانک اس نے اپنے عقب سے متعدد فائروں کی آواز سنی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چاروں پولیس کانسٹیبل زمین پر پڑے تھے اور ان کے خون سے زمین رنگین ہو چکی تھی۔ جبران چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا اچانک اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ ٹارچ کی روشنی تھی جو کہ سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس نے فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ چند لمحوں کے بعد جب اس نے ہاتھ ہٹایا تو اس کو اپنے سامنے کوئی کھڑا دکھائی دیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ دکھائی دیا۔ نوارد نے ٹارچ کی روشنی اپنی طرف کر لی۔ اب اس کی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی جبران کی آنکھوں میں شناسائی کا تاثر ابھرا تھا۔

''تم۔'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔

''ہاں۔ میں یہ سارا کھڑاک تمہارے لئے تو تھا۔'' نوارد نے مسکرا کر کہا۔ آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔

''میرے لئے۔'' جبران نے حیرانگی سے جواب دیا۔

''ہاں۔ تمہارے لئے۔''

ناگر نے موقع غنیمت دیکھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھسکنا شروع کر دیا۔ اچانک اس نے ایک نہایت ہی خوفناک منظر دیکھا۔ نوارد نے انسپکٹر جبران کے سر پر پستول رکھ کر گولی

چلادی تھی۔

جبران تڑپ کر فرش پر گرتا دکھائی دیا۔اس کی وردی خون میں نہا چکی تھی۔وطن کا ایک اور سپاہی مٹی کی ناموس پر قربان ہو گیا تھا۔ان میں وہ سپاہی بھی شامل تھا جس کی چھ ماہ پہلے شادی ہوئی تھی۔

ناگر کو یقین تھا۔ہو نہ ہو یہ وہی پر اسرار باس ہے جس نے ان کو ڈکیتی کی ترغیب دی تھی۔

پراسرار باس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی کہ جو بھی خطرہ ہو گا وہ خود نمٹ لے گا۔

☆......☆......☆

رات کے چار بجے درگوش کو جبران کے قتل کی اطلاع ملی تھی۔یہ اطلاع سن کر اس کی بقایا نیند ہی اڑ کر رہ گئی تھی۔وہ لمحہ اس کے لئے حیرت انگیز تھا جب جبران کی لاش اس کے گھر پہنچی تھی۔اذانوں کا وقت ہو چکا تھا اس کا بوڑھا باپ جو کہ مسجد کا امام بھی تھا اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر اپنے فرض سے چوکا نہ تھا۔مغرب کی نماز درگوش نے اسکی امامت میں پڑھی تھی۔مجال ہے جو کہ درگوش نے اس کی آواز میں لغزش محسوس کی ہو۔ایک عجیب طرح کا سکون اس بوڑھے باپ کے چہرے پر تھا۔نہ اس نے اسکے چہرے پر آنسو دیکھے نہ ہی ملال۔اس کو معلوم تھا شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔وہ تو زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔نہ جانے کیوں درگوش جبران کی لاش کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اس نے تو اپنا فرض کبھی نبھایا ہی نہ تھا۔تدفین کے بعد یہ جذبات اسی جگہ ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

جبران کی موت پر ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا۔اس طرح کے انکوائریز کا جو رزلٹ نکلتا ہے وہ سب کو پتہ ہے اس کی فائل بھی دھول مٹی میں دب گئی تھی۔

اس کی موت کے ہفتے کے بعد پولیس ڈیپارٹمنٹ اس کو بھول ہی گیا تھا۔

درگوش اچھی طرح جانتا تھا کہ ہاشم کے خلاف ثبوت اسی پولیس تھانے میں موجود ہیں۔ دو دن کے بعد اس کی پیشی تھی۔ ہاشم کو پوسٹمارٹم رپورٹ اور آلہ قتل سمیت حاضر کرنا تھا۔ پوسٹمارٹم رپورٹ کو بدلوانے میں درگوش کو ڈاکٹر کو دو لاکھ دینے پڑے تھے اور آلہ قتل کو بدلنے میں درگوش کو کوئی زیادہ خاص مسئلہ بھی نہ ہوا تھا بس اس کو بھیس بدلنا پڑا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اب ہاشم کے آزاد ہونے میں کوئی مسئلہ نہ ہوگا اور درگوش یہ خوش خبری سنانے کے لئے بڑے سرکار کے پاس جانے کے لئے پر تولنے لگا تھا۔ بڑے سرکار کے پاس جانے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو پیسہ دوسرا طوسیہ۔ اس پری رخ کی یاد اس کے دل و دماغ سے چمٹ کر ہی رہ گئی تھی ورنہ اس کی زندگی میں بہت سے ایسے مواقع آئے جن موقعوں پر وہ حسن زن سے لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کو حمیرا نامی وہ لڑکی بھی یاد تھی جس نے ایک دو پیش قدمیوں کے بعد ہی اس کو اپنے وجود سے آگاہ کروا دیا تھا۔ ہاں وہ اس کام میں مہارت رکھتی تھی۔

طوسیہ میں کچھ اور بات تھی۔ کچھ نیا پن تھا جس نے اس کے دل کے اس گوشے کو چھو لیا تھا جہاں آج تک کوئی لڑکی نہ پہنچ سکی تھی۔ اس کا رخ ایکبار پھر بڑے سرکار کے ڈیرے کی طرف تھا۔ مقصد صرف اور صرف طوسیہ ہی تھی۔ اس بار وہ پولیس کی وردی میں نہیں بلکہ سول لباس میں تھا اور اس نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کو پولیس والے کی حیثیت سے پہچان جائے۔ اس لئے ڈیرے کے قریب اس کے آدمیوں نے اس کو روکا تو اس نے ایک پرچہ ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”یہ کیا ہے اور تم کون ہو“ ایک لمبے سے آدمی نے کڑک کر پوچھا۔

”اس میں لکھا ہے کہ میں کون ہوں۔ پرچہ ان تک پہنچا دو“ درگوش نے پرسکون لہجے میں کہا۔

درگوش کی بات سن کر ان دونوں آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے اور پھر وہی لمبا آدمی درگوش کی طرف بڑھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرد لہجے میں بولا۔ ''بڑے سرکار کا حکم ہے جب تک کوئی اپنی شناخت نہ بتائے اس کو اندر نہ آنے دیا جائے۔''

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہی درگوش کا خون تو کھول گیا تھا مگر پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

''بھائی! میں نے آپ سے کہا ناں کہ یہ پرچہ پڑھتے ہی مجھے اندر بلا لیں گے۔''

''ابے سالے، تجھے کہہ دیا جو ایک بار تو اپنی شناخت بتائے بغیر اندر نہیں جا سکتا۔'' اتنا کہہ کر اس آدمی نے درگوش کو دھکا دیا۔

دھکا لگتے ہی درگوش کے اندر کا پولیس آفیسر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس نے بڑی ہی زہر خند نظروں سے اس آدمی کو دیکھا پھر جو کچھ بھی ہوا تھا اس کو دیکھ کر وہاں پر موجود بڑے سرکار کے سارے آدمی چونک گئے۔ ان کو اس دبلے پتلے سے آدمی سے یہ توقع نہ تھی۔ دھکا دینے والا اپنے جثہ سے کسی سانڈ سے کم نہ تھا مگر درگوش کے ایک تھپڑ نے اس کو ایک لمحہ کے لئے اپنی جگہ سے ضرور ہلا دیا تھا۔ تھپڑ کھا کر وہ لمحہ تک ساکت ہی کھڑا رہا۔ اسکے چہرے کے تاثرات اس بات کے غماز تھے اس پر پہاڑ سا ٹوٹ پڑا ہے۔ پھر وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

کہا جاتا ہے انسان پیار سے زیادہ مار کی زبان سمجھتا ہے۔ پھر یہی ہوا تھا ان لوگوں نے کسی پالتو جانور کی طرح درگوش کا رقعہ اندر پہنچانے میں دیر نہیں کی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد درگوش بڑے سرکار کے سامنے موجود تھا۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی ہی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ وہ بڑی ہی گہری نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرۂ خاص میں موجود تھے۔

”میں بھی نہ پہچانتا اگر تم یہ رقعہ نہ بھجواتے۔“

درگوش نے دھیرے سے ہنسا اور بولا۔

”میں غیر سرکاری طور پر یہاں آیا ہوں اس لئے۔“

”ہاتھ بڑا ہی سدھا ہوا تھا تمہارا۔“ بڑے سرکار نے تعریفی جملوں سے نوازتے ہوئے کہا۔ جواباً درگوش نے انکساری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے بڑے سرکار۔ اس کو تمیز سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ اب مجھے امید ہے وہ دوبارہ کسی سے بدتمیزی نہیں کرے گا۔“

جواباً انہوں نے شانے اچکائے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد درگوش نے ایک گھنٹی کی آواز سنی جو کہ بڑے سرکار کے ڈیرے کے اندرونی حصوں میں گونج کر رہ گئی۔ اس گھنٹی کی آواز کے چند لمحوں کے بعد ایک آدمی حاضر ہوا تھا جس کو دیکھ کر بڑے سرکار نے کہا۔

”جاؤ بابا، کچھ چائے ناشتے کا بندوبست کرو ہمارے مہمان کے لئے۔“

اس کے جانے کے بعد بڑے سرکار نے درگوش کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

”ہاں بابا، اب کہو ہمارا کام ہوا کہ نہیں۔“

”بالکل بڑے سرکار، درگوش اپنے وعدے کا پابند ہے۔“

اتنا سننا تھا کہ بڑے سرکار کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی تھی جس کو درگوش نے صاف طور پر محسوس کیا تھا۔

”ایک بات آپ سے پوچھوں بڑے سرکار۔“ درگوش نے ٹھہر ٹھہر کر سوچ سمجھ کر اپنے الفاظوں کو مکمل کیا۔

”ضرور۔“

”کیا آپ کسی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو۔“
یہ سن کر بڑے سرکار کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا دوسرے پل وہ چونک کر بولا۔”بابا! ایسا آپ نے کیسے سوچ لیا۔“
”چند وجوہات ہیں جس میں ایک ہاشم ہے جس پر کرمنل چارجز ہونے کے باوجود آپ نے اس کو بچایا اور دوسرا آپ کا شاہانہ رہن سہن ہے۔“
”غلط اندازہ لگایا تم نے آفیسر۔ میں ایک خاندانی شخصیت کا مالک ہوں۔ چند گھریلو تنازعات کی وجہ سے میں آج یہاں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ دھن دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔“ اس کی آواز میں دکھ کی لہریں تھیں۔
”میں سمجھا نہیں۔“
”تم نے جھوری اسٹیٹ کے نواب عاصم مرزا کا نام سنا ہے؟“
”ہاں۔ سنا ہے۔ شاید کوئی حادثہ ہوا تھا۔ یاد نہیں آرہا ہے۔“
”نواب عاصم کے دو بیٹے تھے۔ ایک نواب عاصم کے ساتھ ہی رہ رہا تھا اور دوسرا بیٹا میں تھا۔“
اتنا کہہ کر وہ رک گئے۔ ان کے چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات نظر آنے لگے تھے جیسے کہ پرانی یادوں کو ذہن میں جمع کر رہے ہوں۔ درگوش ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو نوٹ کرتا رہا تھا۔ کبھی ان کے چہرے پر غصہ نظر آنے لگتا تھا اور کبھی دکھ کے گہرے سائے۔ درگوش اس بات کا منتظر تھا کہ وہ خود کچھ بولیں پھر بڑے سرکار نے طویل سانس لی اور کہا۔
”یہ اس دن کی بات ہے جب میں حویلی میں نہیں تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا

ہوا تھا۔ وہاں مجھے نواب عاصم کی موت کی اطلاع ملی۔ جب میں وہاں پہنچا تو حویلی میں آگ لگ چکی تھی۔ نواب صاحب کی لاش بھی اس میں جل چکی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ آگ انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے خود لگائی تھی اور اسی میں ہی جھلس گئے۔ اور میرے بھائی نے مجھے حویلی سے نکال دیا اور میں ہاشم کے ساتھ یہاں آگیا۔ ہاشم میرا خاندانی ملازم ہے اور غلطی سے اس سے جرم سرزد ہو گیا ہے اور وہ دوبارہ اب ایسا نہیں کرے گا۔"

اس کی بات سن کر درگوش سوچ میں پڑ گیا۔ ہاشم کی شکل صورت کسی پہلی بار جرم کرنے والے انسان کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ درگوش کا اپنا تجربہ اس کے بارے میں ایک عادی مجرم کا تھا۔

بڑے سرکار کا کریکٹر درگوش کو کافی پراسرار معلوم ہو رہا تھا وہ اب اس کے بارے میں جلد از جلد جاننا چاہتا تھا۔ وہ بڑے سرکار کی باتوں سے الجھ سے ضرور گیا تھا مگر اس کا دھیان اب بھی اس قتالہ کی طرف تھا۔ صرف اور صرف طوسیہ کا خیال ہی اس کو یہاں کھینچ لایا تھا کیونکہ اس کی ایک جھلک نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے اس سناٹے کو چیرتے ہوئے دیو قامت درختوں کے درمیان ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد ایک ہائی روف نادر محل کے سامنے آکر رک گئی تھی۔ سب ہی اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے ناگر نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بھرپور انگڑائی لی اور چاروں طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ چند لمحے پہلے وہ لوگ موت کے منہ سے واپس پلٹے تھے۔ ناگر کو یقین تھا جبران کو ہمیشہ کی نیند سلانے والا اس کا پراسرار باس ہی تھا مگر وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ پایا تھا۔ وہ گہری

نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر اتفاقاً آج پورا چاند موجود تھا جس کی وجہ سے نادر محل کی پر اسرار عمارت اور بھی خوفناک معلوم ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی ساری بھولی بسری کہانیاں اس کے دماغ میں تازہ ہو گئی تھیں مگر وہ اس ماحول سے قطعی مرعوب نہیں ہوا تھا۔

ناگر نے ترچھی نظروں سے نادر محل کو دیکھا اور پھر بلند آواز سے بولا۔

"باہر آجاؤ بزدلوں۔ اندر کیوں چھپے ہوئے ہو۔"

یہ الفاظ کافی کارگر ثابت ہوئے تھے۔ سبھی ایک ایک کرکے باہر نکلنے لگے تھے۔ ناگر نے اپنے تینوں ساتھیوں کو غور سے دیکھا اور پھر کافی سخت لہجے میں ان کو سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

"ڈوب مرو۔ تم نے مجرموں کی ناک کٹوا دی آج۔ مجرم تو مرد ہوتے ہیں اور تم عورتوں سے بھی بدتر ہو۔"

ان میں سے جس کا نام جیک تھا وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"استاد! بزدلی کا طعنہ مت دو۔ بات انسانوں کی نہیں بھوتوں کی ہے۔"

"تم نے اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھا ہے اس محل میں ہے۔" ناگر کا انداز طنزیہ تھا۔

"مگر وہ ناچتی ہوئی کھوپڑی۔" جیک کی جگہ پنچو نے جواب دیا تھا۔

"استاد! خون کرنا کوئی مشکل نہیں مگر بھوت۔" ٹونی نے کپکپاتے ہوئے کہا یہ ان کا تیسرا ساتھی تھا۔

"بکواس بند کرو۔ ہم اندر جا رہے ہیں محل میں۔"

"نن۔ نہیں۔" تینوں یک زبان ہو کر بولے۔

"بکومت۔" ناگر دھاڑا۔ "ناگر کو انکار کرنے والا صرف موت کا منہ دیکھتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو میری ایک گولی تم تینوں کو بھوت بنا کر اس محل میں بھٹکنے پر مجبور کر دے۔" اس کا لہجہ سرد

تھا۔ یہ سن کران تینوں کو واقعی سانپ سونگھ گیا تھا اور پھر وہ تینوں محل کی جانب قدم بڑھانے لگے تھے۔ سب سے آگے ناگر تھا جو کہ بڑی ہی بے پروائی سے آگے بڑھ رہا تھا جبکہ وہ تینوں خوفزدہ انداز میں اس کے پیچھے تھے۔

"یہ کسی دن ہم کو مروا کر چھوڑے گا۔" جیک نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ جیک کی آواز اتنی سلو تھی کہ وہ تینوں ہی سن سکتے تھے۔

جیک کے اس ریمارکس پر کسی نے جواب نہ دیا اور خاموشی سے اسکے پیچھے چلتے رہے۔ اب وہ سارے محل کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ سب سے آگے ناگر تھا۔ ناگر کے قدم ازخود ایک جانب اٹھ رہے تھے۔ جلد ہی وہ چاروں ایک بند دروازے کے سامنے موجود تھے۔

ناگر نے دروازے پر تین بار دستک دی۔ محل آنے سے پہلے ناگر کو اس پراسرار باس نے فون پر بتادیا تھا کہ کیا کرنا ہے چنانچہ اس نے وہی کیا تھا۔ اور پھر دروازہ خود بخود اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ پھر انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو دیکھ کران کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس ہال نما کمرے میں زندگی کی ہر ضروریات موجود تھیں۔ ایک طرف درجن بھر کے قریب کرسیاں لگی تھیں ۔ وہ ساری کی ساری لکڑی کی تھیں۔ ان کرسیوں کے ساتھ ہی ایک بڑی سی میز بھی تھی جو کہ خالی ہرگز نہ تھی۔ اس میز پر انواع اقسام کے کھانے موجود تھے جن میں بریانی بھی تھی، قورمہ بھی بروسٹ بھی تھا تو مٹن بھی ساتھ ہی سبزی بھی اور ایک طرف موسمی اور غیر موسمی قسم کے پھل اور بہترین قسم کی شرابیں بھی موجود تھیں۔

ناگر کے ہونٹوں پر اس طرح کی مسکراہٹ تیر رہی تھی جیسے کہ یہ سارے انتظامات اس نے خود کئے ہوں۔

"دیکھا تم نے یہ سب کیا کسی بھوت بنگلے میں یہ سب مل سکتا ہے۔" ناگر نے فاتحانہ انداز

میں کہا۔

''واقعی۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے ناگر دادا۔'' جیک بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ سب باس کا کیا دھرا ہے۔وہ اپنے لوگوں کی ضرورتوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔''

اچانک ان کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی جس کو سن کرناگر چونک پڑا۔وہ آواز بھلا اس کے باس کے علاوہ کسی اور کی نہیں سکتی تھی۔یہ آواز اس کے تینوں ساتھیوں نے بھی سنی تھی جو کہ قدرے بیٹھی ہوئی تھی اور ہال میں چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔سب ہی اس کی جانب ہمہ تن گوش ہو گئے تھے

''میرے ساتھیو۔تم سب کو نادر محل میں خوش آمدید۔''

''شکریہ باس۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔اس لئے میں نے تم لوگوں کے لئے اس پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا ہے۔'' پراسرار باس کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ناگر کے چیلے اب اس میز کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن ناگر کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''کھاؤ، پیو۔اور یاد رکھو میں وفاداروں کے ساتھ وفاداری کرتا ہوں اور غدار کو موت کی پرسکون نیند سلانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔'' وہی آواز پھر ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔اس بار اس لہجے کی سفا کی کو چاروں نے محسوس کیا تھا۔

پھر وہ چاروں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔جب وہ خوب سیر ہو کر کھا چکے تو کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے تھے۔نادر محل کا خوف اب ان کے دلوں سے نکل

چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس ہال نما کمرے کی دیواریں ایک بار پھر گونج اٹھیں اور سب اس کی طرف پوری طرح سے متوجہ ہو گئے تھے۔ شاید پراسرار باس کوئی حکم جاری کرنے والا تھا جس کو سننے کے لئے سب ہمہ تن گوش تھے۔

☆......☆......☆

درگوش اس سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا جس کی ایک جھلک نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا۔

''کہاں کھو گئے۔ انسپکٹر صاحب۔'' بڑے سرکار کی آواز پر وہ چونکا تھا۔

''کچھ نہیں۔ یونہی۔ میں چلتا ہوں۔ میں نے آپ کا کام کر دیا ہے، نذرانے کی رقم میرے اکاونٹ میں ٹرانسفر ہو جائے تو اچھا ہے۔'' اس نے اپنی خجالت مٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے وہ کوئی مسئلہ نہیں تمہاری اماؤنٹ تم تک پہنچ جائے گی۔ اور اتنی بھی جلدی کیا ہے جانے کی، کچھ کھا پی کر جاؤ۔''

''ارے۔ نہیں شکریہ۔''

''چلو پھر باہر نکلتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کہاں۔''

''صحن میں دراصل دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ناں۔'' بڑے سرکار کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

صحن کا سن کر اسکا دل اندر سے خوش ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی مراد تو یہی تھی کہ کسی بھی طرح طوسیہ کو دیکھ لے۔ پہلی بار اس صحن میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے اپنے ایک خاص ملازم کو آواز لگائی جو کہ مراد کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ چند لمحات کے بعد مراد اس کے سامنے تھا۔ مراد کو اس نے ٹھنڈے مشروبات کا آرڈر دیا۔ وہ فوراً ہی گھوم

گیا تھا۔ مراد کے جانے کے بعد وہ دونوں کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آ گئے۔ یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ طوسیہ وہاں موجود تھی اور اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں خرگوش کا بچہ دبا ہوا تھا۔

"میری بیٹی خرگوشوں کے پیچھے پاگل ہے۔" اتنا کہہ وہ ہنسا اور طوسیہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جواباً درگوش نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے دل میں تو اس وقت کلیاں سی کھل اٹھیں تھیں۔ یہ تو فطری عمل ہے جب محبوب سامنے ہو تو انسان کو وہی دکھائی دیتا ہے۔

طوسیہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں اس کے لئے شناسائی کے کوئی آثار نہ تھے کیونکہ درگوش نے تو حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ قریب ہی چند آرام کرسیاں موجود تھیں۔ بڑے سرکار نے اپنے لئے ایک کرسی منتخب کی اور دوسری درگوش کے لئے۔ درگوش کی کرسی کچھ ایسے رخ پر تھی اس گل بکاؤلی کا رخ عنبر صاف دکھائی دیتا رہے۔ پھر وہ چور نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے خرگوش کے ساتھ ہی کھیل رہی تھی۔ پھر وہ اٹھی اور حویلی کے اندرونی حصہ کی جانب چل دی۔ درگوش بڑی ہی محویت سے اس کی سبک چال دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بڑے سرکار کو ہاشم کی رہائی کا یقین دلایا اور وہاں سے نکل آیا تھا۔

یہ دنیا بھی بڑی عجیب جگہ ہے جب کوئی بڑا آدمی یا اس کے لوگ جرم کرتے ہیں تو اس کو بچانے کے لئے ساری مادی قوتیں متحرک ہو جاتی ہیں لیکن وہی جرم کوئی عام انسان کرے تو پورا قانون اس کو سخت سزا دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ہاشم کے کیس میں بھی یہی ہوا تھا۔ وہ بری ہو گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے یہ ثابت ہوا کہ ہاشم نے کوئی ریپ اور خون نہیں کیا تھا۔ پولیس نے بلاوجہ اس کو گرفتار کیا تھا۔ عدالت نے اس کیس کی دوبارہ سے چھان بین کرنے کا حکم دیا اور اس کو رہا کر دیا۔

کہتے ہیں قدرت کا قانون ہر چیز سے بالاتر ہے۔ اس کا انصاف ہمیشہ ٹھیک ہوتا ہے۔

مجرم سات پردوں میں بھی چھپ جائے مگر اس کے فیصلے سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ہاشم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرۂ عدالت سے باہر نکل کر سڑک پر پہنچا اس کی بے احتیاطی رنگ لائی۔ ایک تیز رفتار اور بے قابو ٹرک نے ہاشم کو زوردار ٹکر ماری جس سے وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع ہونا شروع ہوئی لیکن وہ ڈرائیور تو بھاگ نکلا تھا۔ شاید قدرت کا انصاف یہی تھا۔ کبھی کبھی ظالم کو اس دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے۔

درگوش کو خود پر بے حد غصہ تھا کہ اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ جس کا وہ اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔

نہ جانے کتنی ہی خوبصورت لڑکیاں اس کی زندگی میں آئی تھیں جن کو اس نے ایک وقت کے بعد چھوڑ دیا تھا مگر یہ لڑکی تو شاید سب سے الگ تھی۔ مگر تھی تو یہ بھی ایک لڑکی ہی، نہ جانے کیوں اس کو طوسیہ ہی ہر جگہ نظر آنے لگی تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا، ہاشم کی رہائی میں کسی حد تک طوسیہ کا بھی ہاتھ تھا لیکن ہاشم تو حادثہ میں مارا جا چکا تھا۔ بڑے سرکار کی ذات بھی اس کو پراسرار لگی تھی۔ پرانی فائلوں میں نواب عاصم کی موت اس کا سبب خودکشی درج تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کو ایسا لگتا تھا اس کہانی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔

وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود تھا اور ایک فائل کی ورق گردانی کرتے وقت یہی سوچ رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے فائل کو میز پر پٹخا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے میز پر موجود گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد شیدا آ گیا تھا۔

''ہاں شیدے۔'' درگوش نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''تم نے کچھ دن قبل مجھے اس علاقے کے پرستانی اڈوں کے بارے میں بتایا تھا۔''

''جج۔جی ہاں۔وہ سنبھل کر بولا۔

''کبھی گئے ہو وہاں پر۔''

''جی۔۔''شیدا ہکا بکا رہ گیا۔جی زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔

''جواب دو۔جو پوچھ رہا ہوں۔''

جواباً ہلکی سی مسکراہٹ شیدے کے چہرے پر عود آئی اور پھر وہ سر جھکا کر بولا۔

''جناب! آپ سے کیا چھپانا۔ضرور گیا ہوں۔میری بیوی اکثر بیمار رہتی ہوں اس لئے ذہنی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔''

''گڈ۔اب سنو۔اوپر سے سخت ہدایات آئی ہیں ان اڈوں کو بند کروانے کے بارے میں۔ہم کو ان جگہوں پر چھاپے مارنے ہیں۔اس سے قبل میں بذات خود ان کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔آج ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اس انوسٹی گیشن میں تم میرے ساتھ رہو گے۔اس کے بعد ہی کوئی ٹھوس قدم اُٹھایا جائے گا۔''

درگوش کی بات سن کر شیدے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی اور وہ مسکرانے لگا تھا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا جسم فروشی کے اڈے نہ کبھی بند ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔جب تک عورت کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانے والے،اس پر ظلم کرنے والے لوگ زندہ ہیں یہ اڈے کبھی بند نہیں ہو سکتے۔یہ تو صاحب کا بہانہ ہے ان اُڈوں سے مستفید ہونے کے لئے۔

''جی بہتر۔میں آپ کو بلبل ہزار داستان لئے چلوں گا جہاں یہ دھندا عروج پر ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم صرف سادہ لباس میں وہاں جائیں گے تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔''

جواباً شیدا نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔درگوش نے وہاں جانے کے لئے میک اپ کا سہارا لیا تھا جس سے اس کی شکل ہی بدل گئی تھی۔شیدا اس کو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔یہ

سب حفظ ماتقدم کے طور پر تھا۔

یہ ایک خاصا چلتا ہوا بازار تھا جس کے عقب میں وہ عمارت موجود تھی جہاں پر جسم فروشی کا دھندا ہوتا تھا۔

''سر جی، سامنے والی گلی میں سیدھے ہاتھ پر مکان نمبر 19 ہے۔''

''ارے تم بھی چلو۔'' درگوش چونک کر بولا۔''کیا مجھے چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔''

''نن۔نہیں جناب ایسی بات نہیں ہے۔گھر جلدی جانا ہے۔گھر والی بیمار ہے آپ کو بتایا تو تھاناں۔''

''سچ بول رہے ہو۔'' درگوش نے اس کو گھورا۔

''بالکل جناب۔'' پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔''جیسے ہی دروازہ کھلے تو آپ نے کہنا ہے کالے گلاب سے ملنا ہے بس۔''

''اوہ۔باقاعدہ کوڈ ورڈ ہے یہاں پر۔''

''بالکل جناب، آج کل ہر کوئی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔''

''ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔'' درگوش نے طویل سانس لے کر کہا۔یہ بات وہ نہیں جانتا تھا کہ شیدے کا بہت سا ادھار باقی ہے اس وجہ سے اندر جانے سے گھبرا رہا تھا۔اس کے جانے کے بعد درگوش نے شیدے کی ہدایات پر من وعن عمل کیا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک دروازے کے سامنے موجود تھا۔اس نے بیل بجائی، چند ہی لمحات گزرے ہوں گے کہ گیٹ کے اوپری حصہ والی کھڑکی کھل گئی۔

''کون ہے؟'' ایک مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''کالے گلاب سے ملنا ہے۔'' اس نے شیدے کے الفاظ دہرائے۔

''اوہ۔'' چونک کر کہا گیا۔ ''پھر تم اندر آ سکتے ہو۔''

چند ثانیے کے بعد دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ سامنے ایک دبلا سا لمبا آدمی موجود تھا۔ اس نے قدرے جھک کر اُسے راستہ دیا تھا۔

ایک چھوٹی سی راہداری سے گزرنے کے بعد دائیں طرف والے کمروں سے گزرنے کے بعد اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ وہ کسی ہوٹل میں آ گیا ہو۔ کونے میں ایک خوبصورت سا کاؤنٹر موجود تھا جس کے گرد کافی لوگ موجود تھے۔ یہ ہال نما کمرا تھا جس میں میزیں اور کرسیاں موجود تھیں۔ ہر میز پر نمبر والا ایک کارڈ موجود تھا۔ ہر میز پر ایک سے ایک حسین لڑکی موجود تھی۔ کوئی تنہا تھی اور کسی کا پارٹنر موجود تھا۔

کاؤنٹر کے اندر ایک آدمی موجود تھا جو کہ لوگوں سے رقم وصول کر کے ان کو میزوں پر بھیج دیتا تھا۔ درگوش یہ سسٹم دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ فحاشی کے اڈوں کے متعلق اس کے دل و دماغ میں میں روایتی قسم کے خیالات تھے۔

''جی سر۔'' کاؤنٹر کلرک نے اس کو سر سے پیر تک اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کالا گلاب۔''

''خوب۔ سر، کیا آپ اپنا نام بتائیں گے؟''

''جگدیش ورما۔'' درگوش نے فرضی نام بتایا۔

''اوکے۔ مسٹر ورما۔ کیا آپ کی بکنگ ہے؟''

''نہیں۔ میں پہلی بار آیا ہوں۔''

''اوہ۔ تو پھر آپ ہال کا جائزہ لیں، جو پھول آپ کو پسند ہو اسی میز پر جا کر بیٹھ جائیں۔''

''کوئی بھی چلے گی۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔ اس کی بات سن کر اس کے چہرے پر

مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''آپ بارہ نمبر پر چلے جائیں۔اور ہاں، دو ہزار جمع کروا دیں۔اور تین ہزار اس لڑکی کے ہاتھ میں۔''

درگوش نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور جلد ہی وہ بارہ نمبر میز پر موجود تھا۔بارہ نمبر پر موجود لڑکی کافی خوبصورت اور اس کے معیار کے مطابق تھی۔لڑکی اس کو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کا گڈ نیم سر۔''

''تم مجھے جان کہہ سکتی ہو۔'' درگوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔''لڑکی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔''لیکن یہ جان تو صبح ہوتے ہی چلی جائے گی۔''

وہ کافی تیز طرار معلوم ہوتی تھی۔

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔یہ جان رات میں بھی جا سکتی ہے۔'' درگوش نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔اس کی بات سن کر لڑکی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔اور بولی۔

''کافی دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

درگوش کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ویٹران کے سامنے آگیا۔

''آرڈر ہے جناب۔''

''کیا یہاں کھانے پینے کا انتظام ہے؟''

اسکی بات سن کر لڑکی نے غور سے اس کو دیکھا اور بولی۔

''کیا آپ پہلی بار آئے ہیں۔''

''ہاں۔''

''اوہ۔جب ہی۔'' وہ مسکرائی۔'' آپ کا آرڈر لکھا جائے گا۔ٹھیک بارہ بجے یہ کمرا بند کر دیا جائے گا۔آرڈر آپ کو کمرے میں تیار ہی ملے گا۔''

یہ سن کر درگوش حیران رہ گیا تھا کہ جسم فروشی کا یہ اڈہ اپنی طرز کا اچھوتا ہی ثابت ہو رہا تھا۔ یہ کافی حیران کر دینے والا تھا۔

''تم خود ہی آرڈر منگوا لو۔'' درگوش نے اس لڑکی سے کہا۔

''اچھا۔شراب کون سی۔''

''میں شراب نہیں پیتا۔''اس نے جلدی سے کہا۔

لڑکی نے غور سے اس کو دیکھا اور پھر ویٹر سے کچھ کہنے لگی۔وہ سادہ کاغذ پر جلد از جلد آرڈر لکھنے لگا۔

''بڑا اچھا نظام ہے یہاں کا،ماحول بھی کافی صاف ستھرا اور منفرد ہے۔''

''یہاں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔''وہ فخر سے بولی۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''کیا رکھا ہے نام میں۔صبح تک لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔''اس کے انداز میں تلخی در آئی۔

''پھر بھی۔یہ دنیا کی رسم ہے۔''وہ سر ہلا کر بولا۔

''بچپن میں میرا نام لڑکی تھا۔ہوس پرستوں نے مجھے لڑکی سے عورت بنا دیا اور اب میں صرف ایک عورت ہوں۔''

''لگتا ہے زمانے کی ستائی ہوئی ہو۔''

''ہاں شاید۔''

’’شاید تم ذاتیات پر بات نہیں کرنا چاہتی۔‘‘

’’میں اور میری ذات کیا صاحب۔‘‘ وہ حقارت سے بولی۔ ’’تھوڑی دیر کے بعد جب میں تمہارے ساتھ کمرے میں جاؤں گی تو میرے وجود کا ہر کونا تمہارے سامنے ہوگا۔ اور پھر کہاں رہی میری ذات۔‘‘ اس کا لہجہ کافی تلخ تھا۔

’’اس قدر اکتائی ہوئی تو اس ماحول سے نکل جاؤ۔‘‘

’’کہاں جاؤں نکل کے۔ یہاں ایک رات میں ایک درندہ ہے۔ باہر کی دنیا تو بہت سے درندوں سے بھری ہوئی ہے۔‘‘

’’کیا تم اکیلی ہو؟‘‘ درگوش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

’’نہیں۔ دو درجن لڑکیاں ہیں ناں۔‘‘

’’اوہ۔ میرا مطلب تمہارے رشتہ داروں سے ہے۔‘‘

’’ایک باپ تھا بے چارا۔ جب اس کو پتہ چلا ہوگا کہ اس کی اکلوتی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے تو خودکشی کر لی ہوگی بے چارے نے۔‘‘ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ اس کی بات سن کر درگوش خاموش رہا تھا۔

’’ارے۔ کیا فالتو کی بات کر رہی ہوں میں، کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔‘‘ اسکا لہجہ مغموم تھا۔ درگوش نے دیکھا کہ اس کی آنکھ سے آنسو بھی ٹپک پڑا ہے۔ اس سے قبل درگوش کچھ کہہ پاتا، لاؤڈ اسپیکر سے آواز بلند ہوئی۔

’’معزز مہمانوں سے درخواست ہے کہ اپنے اپنے کمروں کا رخ کریں۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں اور ہال بند ہونے والا ہے۔‘‘

’’کمرے میں چلیں۔‘‘ لڑکی اٹھتے ہوئے بولی۔ ’’ویسے مجھے شازیہ کہتے ہیں۔ یہ نام

میرے بابا نے رکھا تھا۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں موجود تھے جو نمبر آصف درگوش کو دیا گیا تھا وہی کمرے کا نمبر تھا۔

کمرے میں چاروں طرف ماحول خاصا صاف ستھرا تھا۔ایک طرف بیڈ کے قریب ایک چھوٹی سی میز موجود تھی جس پر کھانے پینے کی اشیا موجود تھیں ۔شازیہ کی بات ٹھیک تھی۔ ویٹر نے سامان کمرے میں پہنچا دیا تھا۔شازیہ نے بھی کرسی کھسکائی اور براجمان ہو گئی۔

"آپ کچھ کھالیں۔"

"اس کھانے میں زہر تو نہیں۔" درگوش نے مسکرا کر کہا۔اس کی بات سن کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

"نہیں۔زہر تو میری زندگی میں گھل چکا ہے۔میں کسی اور کے لئے کیا زہر مہیا کروں گی۔"

اس کی بات سن کر درگوش خاموش ہو گیا۔اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اپنی خوشی سے اس کاروبار میں نہیں ہے۔مگر اس کو کیا لینا دینا وہ تو اس زندگی کو اپنی خوشی سے قبول کر چکی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد شازیہ بولی۔

"چلیں وقت نکلا جا رہا ہے۔"

"تو؟"

"ارے وقت نکلا جا رہا ہے۔جلدی آجائیں ورنہ رات بہت ہو جائے گی۔" وہ ایک ادا سے بولی تھی۔

"چلو۔" وہ اُٹھ کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

شازیہ اس کو غور سے دیکھنے لگی تھی۔درگوش کافی گہری سوچ میں گم تھا۔تھوڑی ہی دیر کے

بعد اس نے شازیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا تم کوئی ایسا طلسم کر سکتی ہو کہ میں آج کی رات کسی کو بھول جاؤں۔"

"کس کو بھول جانا چاہتے ہیں ویسے بھی میں کوئی جادوگرنی تھوڑی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"ہر خوبصورت عورت ایک جادوگر ہی ہوتی ہے۔ویسے بھی میں نے سنا تھا ان دکانوں میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔"

"آپ کی بات سمجھ گئی۔ان بازاروں میں لوگ محبت کی چوٹ کھا کر آتے ہیں۔اور اس چوٹ کو بھلانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔خیر میں کوشش کی کروں گی کہ میرا قرب آپ کو وہ سب بھلا دے۔"

اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور کمرے کی روشنی گل کر دی۔اس کے ساتھ ہی کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

دوسرے دن کی صبح کافی خوشگوار تھی۔وہ جب نہا دھو کر نکلا تو شازیہ چائے کی ٹرے کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔وہ اس کو دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرائی۔

"اوہو۔تو چائے کا بھی انتظام ہے۔"

"ہاں بالکل تاکہ گاہک دوبارہ یہاں کا رخ کرے۔"

"کیا میرا قرب اس کو بھلانے میں آپ کا مددگار ثابت ہوا۔" شازیہ نے چائے پیتے ہوئے درگوش سے پوچھا۔

"نہیں۔تمہارے بھرپور انداز سے اس کی طلب اور بڑھ گئی ہے۔میں اب اس کو ہر قیمت پر حاصل کروں گا کیونکہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ہاں محبت۔" اتنا کہہ کر درگوش نے جیب سے تین ہزار روپے نکالے اور شازیہ کے سامنے میز پر رکھ دیے اور باہر نکل گیا۔

شازیہ اسکو جاتے ہوئے دیکھتی رہ گی اور زیرِ لب بڑبڑا کر بولی۔

”تم کیا جانو محبت۔ محبت وہ زہر ہے جو انسان کو برباد کر دیتا ہے جیسے کہ آج میری زندگی برباد ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ناگر اور اس کے ساتھیوں نے اس قدر شاندار دعوت کبھی بھی نہیں کھائی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پراسرار باس کی آواز پھر ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

”میرا خیال ہے، اب کام کی بات شروع کی جائے۔“

”جی باس۔“

”سنو میرے ساتھیو۔ یہ جگہ بہت بہتر ہے۔ اب جو میں کام شروع کرنے والا ہوں اس کے لئے میں بہت عرصے سے پلان کر رہا تھا اپنے کام کے لئے اور اب میں مکمل طور پر اس پلان کو اپنے ہاتھ میں لے چکا ہوں۔ میری برسوں کی محنت اور سوچ رنگ لے آئی ہے۔ اب تک جو بھی کام ہم نے کئے وہ صرف اور صرف وقت گزاری کے تھے اور تمہارا امتحان تھا۔ اب وقت آیا ہے کروڑ پتی بننے کا۔“ باس کی آواز میں عجیب سا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جس کو ناگر کوئی نام نہ دے سکا تھا۔

ویسے ناگر کے لئے یہ بات بھی کافی خوشی کی تھی کہ وہ جلد ہی امیر ہو جائے گا۔

”باس! ہم کو کرنا کیا ہو گا۔“ ناگر نے بے تابی سے کہا۔

”یہ علاقہ ویران اور بے آباد ہے۔ یہاں تھوڑے فاصلہ پر ایک درختوں کے درمیان سے اونچے نیچے ٹیلوں سے ہوتا ہوا ایک غیر آباد سمندر کے ویران کنارے جا کر ختم ہو جاتا ہے۔“

”سمندر کا ویران کنارا۔“ ناگر نے حیرت سے کہا۔
”ہاں سمندر کا ویران کنارا۔ جہاں ہمارے لئے دولت ہی دولت ہی ہے۔ تم لوگ رات کے بارہ بجے وہاں جاؤ گے۔ رات کے ایک بجے ایک لانچ آ کر رکے گی۔ اس لانچ میں جو کچھ بھی ہو گا وہ بحفاظت نادر محل میں منتقل کرنا ہے۔“
”وہ سامان کس قسم ہے۔“ جیک نے پوچھ لیا۔ چند لمحات تک خاموشی رہی اس کے بعد باس کی غصہ بھری آواز سنائی دی
”یہ ایک غیر ضروری سوال ہے۔ زیادہ غیر ضروری سوال تمہاری زندگی پر فل اسٹاپ لگا سکتے ہیں۔ اب جاؤ اس جگہ کا معائنہ کرو۔ جہاں وہ سامان آنے والا ہے۔ جاؤ شاباش۔“
لہجے کی سفاکی محسوس کر کے ناگر اور اس کے ساتھی کانپ گئے تھے۔

☆......☆......☆

بڑے سرکار اپنے مخصوص کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے سوچ میں غرق تھے۔ عین اسی وقت مراد کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
”سرکار! جمال دین آیا ہے۔“
اس کی بات سن کر وہ چونک سے گئے اور مڑے بغیر پروقار لہجے میں بولے۔
”اس کو مہمان خانے میں لے کر جاؤ میں آ رہا ہوں۔“
مراد کے جانے کے بعد بڑے سرکار کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر دھیرے سے اُٹھے اور کمرے کے کونے میں موجود الماری کی جانب بڑھے اور الماری سے ایک ریوالور نکالا اور شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ اور پھر الماری کا پٹ بند کر دیا۔
وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سامنے طوسیہ کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

"تت۔تم۔ابھی سوئی نہیں۔"
"نہیں بابا جانی۔میں ایک بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔"
"ہاں۔بولو۔"اس کے لہجے میں شفقت کا عنصر نمایاں تھا۔
"اگلے ہفتے نیلم کی شادی ہے۔"
"جانتا ہوں کہ وہ تمہاری فرینڈ ہے اور تم اس کی شادی میں شرکت کرنا چاہتی ہو۔" بڑے سرکار نے مسکرا کر کہا۔"ضرور کرو۔مگر شادی کب ہے۔"
"اس اتوار کو۔اور میں تمام رسومات میں شرکت کرنا چاہتی ہوں۔اور ہفتہ بھر کے لئے میں اس کے گھر جانا چاہتی ہوں۔"
نہ جانے کیوں طوسیہ کے منہ سے جملہ سن کر بڑے سرکار کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس نے بے چین ہو کر کہا۔
"لیکن طوسیہ۔ہفتہ بھر تو بہت ہوتا ہے تم رسموں میں ضرور شرکت کرو لیکن۔۔لیکن شام کو جاؤ اور رات کو واپس آجاؤ۔"
اتنا سننا تھا کہ طوسیہ کا منہ پھول گیا اور وہ غصہ سے پیر پٹخ کر بولی۔
"اس طرح تو مزا نہیں آئے گا بابا جانی۔میں صرف نیلم کے گھر ہی تو جا رہی ہوں اور کسی دوسری جگہ تو نہیں۔آپ مجھے کہیں بھی جانے نہیں دیتے۔" اس کے لہجے میں غصہ تھا۔
"نہیں۔رات کو نہیں۔میں تم کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ تم رات میں گھر سے باہر رہو۔" بڑے سرکار نے غصہ سے کہا۔
"میں جاؤں گی۔اور ضرور جاؤں گی۔اپنی فرینڈ کی شادی میں باہر آوارہ گردی تو کرنے نہیں جا رہی۔" جواباً طوسیہ بھی غصے سے بولی۔

”اچھا بابا۔ جاؤ۔“ بڑے سرکار نے جھلا کر کہا۔ ”مگر اتنا بتاؤ کہ تمہارے خرگوشوں کا کیا ہوگا۔“

”میں نے ان کو بتا دیا ہے۔“ وہ لاپروائی سے بولی۔

”اور میرا کیا ہوگا۔ تم چلی جاؤ گی تو میں کیسے رہوں گا۔“

”جس طرح میں رہوں گی۔“ طوسیہ کا جواب تھا۔

”اچھا ابھی جا کر سو جاؤ۔ باقی باتیں کل صبح کریں گے۔“

”کل نیلم مجھے لینے آرہی ہے۔ اور میں اس کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی بڑے سرکار کے ماتھے پر سوچ کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

”یہ سب میں تیری خاطر تو کر رہا ہوں پھر تم کو خود سے کیسے دور کر دوں۔ لیکن ہر وقت تو من مانی نہیں چلتی ناں۔ مجھے کبھی تمہاری بھی ماننی پڑے گی۔ ایک ہفتے کی بات تو ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ مہمان خانے کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

شازیہ کے پاس سے آنے کے بعد اس کے دل کی بے کلی بڑھ گئی تھی۔ جس محبت کو بھلانے وہ اس اڈے پر گیا تھا وہاں اس کی یاد شدت سے آنے لگ پڑی تھی۔ پھر وہ گھر آکر سو گیا تھا اور اگر موبائل فون کی بیل نہ بجتی تو شاید وہ کافی دیر تک سوتا رہتا تھا۔

آج شام پولیس کے اعلیٰ آفیسران کی ایک اہم میٹنگ طلب کی گئی تھی جس میں تمام چھوٹے بڑے آفیسران کو طلب کیا گیا تھا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہونے اور ناشتہ کرنے کے بعد وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف نکل پڑا تھا۔

کانفرنس روم میں تمام بڑے آفیسران موجود تھے۔ ایک بہت بڑی لمبی سی میز تھی جس

میں پورے شہر کے ہر ٹاؤن کے آفیسر تشریف فرما تھے۔ میز کے بالکل سامنے وہی اعلیٰ آفیسر موجود تھا جس نے یہ میٹنگ طلب کی تھی۔ اس کے بالکل پیچھے ایک بڑی سی خوبصورت سکرین نصب تھی۔ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے تمام آفیسران کی چائے اور سموسوں سے تواضع کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس آفیسر نے بولنا شروع کیا تھا۔ اس کا انداز بڑا ہی نرم تھا جس کے لب و لہجے سے درگوش سمیت تمام لوگ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اس کا نام اقبال بھٹی تھا جو کہ دوسرے شہر سے اس شہر میں آیا تھا۔ اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میرے جاں نثار اور محبِ وطن ساتھیو! مجھے آپ پر فخر ہے۔ خاص کر جبران اور اس کے ساتھیوں پر۔ جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ ہمارے شہر میں امن و امان کی صورت حال قائم رکھنا ہی پولیس کی ذمہ داری ہے اس لئے ہم نے ایک حکمت عملی طے کی ہے۔ شہر میں بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام کے لئے ایک ایکشن ٹاسک فورس بنائی جائے گی جس کا کام شہر کے اندر جرائم کی روک تھام ہوگا۔ اس فورس میں اس شہر کے جانے مانے آفیسران شامل ہونگے جن کی امیج پولیس ڈیپارٹ میں اچھی ہوگی۔ اب ایک خاص بات اور ہمارے خاص مخبر کے وساطت سے اطلاع ملی ہے کہ شہر میں وسیع پیمانے پر اسمگلنگ کا کام شروع ہونے والا ہے۔ وہ اسمگلنگ کس چیز کی ہوگی یہ تو پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن اس کام میں ملک دشمن عناصر کی سپورٹ حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ اعلیٰ آفیسر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ڈرامائی تاثرات تھے۔ اس کے چپ ہوتے ہی کانفرنس روم میں موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ خاص وجہ کیا ہے؟ سب کے چہروں پر سنسنی چھائی ہوئی تھی۔

اقبال بھٹی کی کھوجتی ہوئی نظریں سب کے چہروں پر تھیں۔ وہ حاضرین پر اپنے جملوں کا

تاثر دیکھنا چاہتا تھا۔

''آپ کا اشارہ کس جانب ہے جناب۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''سب ہی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ شہر ملک کا معاشی ستون ہے۔ اور اس کی وجہ سمندر ہے۔ اور وہ اسمگلنگ سمندری راستے سے ہوگی۔ ہم ہر ویران ساحل پر نظر رکھیں گے تاکہ دشمن کے منصوبوں کو ناکام بنایا جاسکے۔'' اقبال بھٹی نے مسکرا کر کہا۔

''سر، ایک سوال ہے۔'' ایک پولیس آفیسر نے کہا۔

''ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

''آپ نے کہا تھا اسمگلنگ کس چیز کی ہوگی یہ اندازہ نہیں ہے پھر بھی اگر کچھ idea ہو جاتا تو۔''

''مال کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے۔ یہ ڈرگز بھی ہوسکتے ہیں اور سونا چاندی بھی۔ کچھ بھی۔ لیکن اس کی روک تھام ہمارا فرض ہے۔ اور بہت جلد ایک ٹیم تشکیل دی جائے گی جس کا کام شہر کے ساحلی علاقوں کی نگرانی ہوگا۔ میں چاہتا ہوں ہر شخص جو اس ٹیم کا حصہ ہو اپنی ذمہ داری کا بھرپور مظاہرہ کرے۔''

میٹنگ کے ختم ہوتے ہی درگوش آفس سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے پارکنگ سے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور پھر گھر کی طرف رواں دواں ہو گیا تھا۔ رات زیادہ نہیں ہوئی تھی ابھی صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ ایک ٹریفک سگنل پر درگوش کو رکنا پڑا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بھی کافی دکھائی دے رہا تھا۔ سگنل کے سرخ ہوتے ہی اس کے برابر ایک ٹیکسی آرکی۔ درگوش نے بے خیالی میں اس کی پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی اور پھر وہ بری طرح سے چونک اٹھا۔

☆......☆......☆

اس ٹیکسی میں دو لڑکیاں تھیں اور دونوں ہی آپس میں بات چیت میں مصروف تھیں۔ ان میں وہ بھی تھی جس کے خیالات نے درگوش کی رات کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے یہاں ایسے ملاقات ہو جائے گی۔

وہ آنکھیں پھاڑے اس لڑکی کو گھور رہا تھا۔ اس حالت میں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ سگنل کھل چکا ہے۔ پچھلی گاڑی کے ہارن کی آواز پر ہوش میں آیا تھا پھر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو واقعی سگنل کھل چکا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے موٹر سائیکل اس ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھا دی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ طوسیہ سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔

طوسیہ اس ٹیکسی میں اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ تھی جس کا نام نیلم تھا۔

"تمہارے بابا بہت ناراض ہو رہے ہوں گے۔" نیلم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بڑے سرکار کو ناراض ہونے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے۔ انہوں نے اعتراض کیا تھا تم سے ملنے پر مگر میں نے بھی کہہ دیا کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔" طوسیہ منہ بنا کر بولی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا طوسیہ، تم کو اس قدر بے جا پابندیوں میں کیوں رکھا جاتا ہے۔ نہ تم کسی سے مل سکتی ہو اور نہ ہی کوئی زیادہ تم سے ملنے آ سکتا ہے۔" نیلم حیرت سے بولی۔

"سمجھ تو مجھے بھی نہیں آتا۔ لیکن اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔ چھوڑ ناں یار۔ کوئی اور بات کر۔"

"مگر تجھے یوں بغیر کسی باڈی گارڈ کے باہر نکلنے کی اجازت کیسے ملی؟"

"یار! تیری شادی جو ہے۔ اسی لئے ضد کی ورنہ اجازت نہیں ملتی۔ وہ صرف شادی کے لئے اس کے بعد پھر گھر کی چار دیواری۔"

دونوں باتیں کرتی رہیں اور ٹیکسی کا سفر جاری رہا۔ جلد ہی ٹیکسی ایک مارکیٹ میں داخل ہو گئی پھر ٹیکسی رکی اور دونوں لڑکیاں باہر نکل آئیں۔

طوسیہ مارکیٹ کی چکا چوند سے حیران رہ گئی۔ وہ ہر چیز کو یوں پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جس طرح پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''نیلم! تم جانتی ہو۔ میں زندگی میں کبھی بھی بازار نہیں گئی۔ جو خواہش کی وہ بابا جانی نے پوری کر دی۔ میں نے باہر نکلنے کی بات کی تو وہ سخت غصہ ہو جاتے۔''

''شاید مجھ سے بھی ملاقات نہ ہوتی اگر تم کالج نہ آتیں تو۔''

طوسیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں مارکیٹ میں ایک دکان کے اندر داخل ہو گئیں۔

درگوش نے موٹر سائیکل کو ایک کنارے پر لگایا اور خود سوچ کر ان کے پیچھے دکان میں داخل ہو گیا جو کہ کافی دیر سے ان کے تعاقب میں تھا۔ یہ گفٹ شاپ کی ایک بڑی دکان تھی جس میں پرفیومز اور لیڈیز میک اپ کا سامان بھی دستیاب تھا۔ دکان میں ایک سیل مین بھی موجود تھا جو اس وقت نیلم سے کچھ کہہ رہا تھا۔

''آپ کے پاس خرگوش کے بچے ہوں گے۔'' درگوش نے کھنکار کر دکان دار کو مخاطب کر کے کہا۔ اس سے قبل دکان دار جواب دیتا، طوسیہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں ہٹا لیں۔

''جی ضرور۔ مگر افسوس، وہ کھلونے کی صورت میں دستیاب ہیں۔'' دکان دار اپنی مخصوص مسکراہٹ سے بولا۔

''اوہ۔ چلو کھلونے کی صورت میں دکھاؤ تو۔'' درگوش نے مایوس ہو کر طوسیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ پہلے ہمیں فارغ کر دیں۔ دیر ہو رہی ہے۔'' نیلم نے قدرے برہمی سے دکان دار سے کہا۔

''جی ہاں۔آپ کی کال آتے ہی میں آپ کا سامان تیار کر دیا تھا بس ابھی لایا۔'' اتنا کہہ کر دکان دار دوسری طرف چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد درگوش براہ راست طوسیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آج خرگوش کے بچے نہیں آپ کے ساتھ۔''

''اے مسٹر! کون ہیں آپ اور اتنی بے تکلفی سے آپ کیوں میری فرینڈ سے بات کر رہے ہیں؟'' نیلم نے رعب سے کہا۔

''ان کا نام تو طوسیہ ہے۔اور آپ کی تعریف۔'' درگوش اس کے لہجے کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

''میں نیلم ہوں۔اور آپ کی تعریف۔''

''میرا نام درگوش ہے، انسپکٹر آصف احمد درگوش۔''

طوسیہ ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ اس کو کیسے جانتے ہیں؟'' نیلم نے طوسیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ساری باتیں یہاں اسی جگہ ہو جائیں گی؟ کسی کافی شاپ میں چل کر بیٹھتے ہیں پھر میں آپ کو سارا قصہ سناؤں گا۔''

اس سے قبل وہ کچھ کہہ پاتی اسی لمحے دکان دار ایک پیکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔اس نے پیکٹ کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کا سامان پیک کر دیا ہے۔آپ کے چار ہزار دو سو ہوئے۔'' دکان دار نے بل بتاتے ہوئے کہا۔

''اتنے زیادہ۔'' درگوش بول پڑا۔

''ہمارے ریٹ فکس ہوتے ہیں جناب۔نہ کم نہ زیادہ یہی چیز آپ اسی کوالٹی میں کسی اور

سے لیں گے۔ چھ یا سات ہزار سے کم کی نہیں ہوگی۔'' دکان دار منہ بنا کر بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔'' نیلم نے پرس سے پیسے نکال کر ادا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے۔کافی شاپ پر چلیں۔'' درگوش مسکراتے ہوئے بولا۔

''ضرور۔'' نیلم نے چند لمحات تک سوچنے کے بعد مسکراتے ہوئے جواب دیا۔طوسیہ نے اس کو گھور کر دیکھا تھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

جمال کیفے اس شہر کا مشہور ترین کیفے تھا۔اس کی مشہوری کی وجہ صرف اس کی کافی ہی نہیں بلکہ اس کے سموسے بھی تھے۔ اس جیسے ذائقہ دار سموسے شاید ہی پورے شہر میں کسی جگہ دستیاب ہوں۔ پھر تینوں جلد ہی اس کیفے کی ایک میز پر موجود تھے۔

''کیا میں آپ کو بہن کہہ سکتا ہوں۔'' درگوش نے کھلے دل سے نیلم سے پوچھا۔اس کی بات سن کر نیلم چونک گئی اور دوسرے پل مسکرا کر بولی۔

''جی۔شوق سے مگر میرا وہی سوال کہ آپ ان کو کیسے جانتے ہیں۔''

''میں ان کے گھر گیا تھا۔اتفاق سے ان سے گھر پر ملاقات ہوئی تھی۔'' درگوش نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ۔'' اس نے طوسیہ کی طرف گھوم کر دیکھا اور بولی۔''کیا واقعی؟''

طوسیہ نے دونوں کو باری باری دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔نیلم کا لہجہ کافی معنی خیز تھا۔حیرت انگیز طور پر اس کا انداز بھی بدل گیا تھا۔

اسی دوران ویٹر کافی لے آیا تھا۔کافی پینے کے دوران خاموشی رہی۔ دفعتاً درگوش نے طوسیہ کو گہری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

''صاف دل سے کہہ رہا ہوں طوسیہ، تمہاری تصویر میرے دل میں اتر گئی ہے۔لفظ محبت کا

مطلب شاید تم کو دیکھنے کے بعد ہی میں سمجھا ہوں۔'' درگوش کا انداز کافی ستھرا تھا۔

''ارے ارے۔ آپ تو۔'' نیلم گھبرا گئی۔ اس سے آگے وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی۔

''میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی بات غلط کی ہے جو دل کی بات ہے وہ کی ہے۔ تم سے شادی کروں گا۔ طوسیہ۔''

طوسیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ہونٹ تھرتھرانے لگے تھے۔ نیلم نے یہ سب دیکھا اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

''کیوں بھئی یہ کیا چکر ہے۔''

طوسیہ نے کوئی جواب نہ دیا بس اس کی گردن جھکی ہی رہی۔ درگوش اور نیلم کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر درگوش دوبارہ بولا۔

''میں آج اپنے دل کا حال بیان کر کے بہت خوش ہوں۔''

''یہ خوشی عارضی ہے۔'' طوسیہ بول اٹھی۔

''کیا مطلب؟'' درگوش نے چونک کر کہا۔

''مطلب۔ صرف اتنا ہے کہ میں اس نیلم کی شادی کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لئے اس کے گھر آئی ہوں۔''

''اوہ۔''

''جی۔'' طوسیہ کے لہجے کا تاثر کچھ عجیب سا تھا۔ ''وگرنہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کسی مرد سے اس طرح بات کر سکوں گی۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو بے زبان جانوروں میں گم کر دیا ہے۔''

''جی۔ میں سمجھا نہیں۔''

''اور میں شاید سمجھا بھی نہ سکوں گی کیونکہ میں خود بھی اس زندگی کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکی ہوں۔ بے زبانوں سے تو راہ ورسم بڑھا سکتی ہوں مگر انسانوں سے نہیں۔''

طوسیہ کے چہرے پر اداسی اور کرب نمایاں تھا۔

''میں ضرور سمجھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں تم کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر طوسیہ کے چہرے کی اداسی اور بڑھ گئی۔ اس نے بے چین ہو کر نیلم کو مخاطب کیا۔

''چلو گھر۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی''۔

طوسیہ کے اس عجیب وغریب رویہ پر نیلم اور درگوش دونوں ہی الجھن کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی درگوش سے دوستی کرنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں کسی اندرونی جذبے کے تحت وہ گھبرا رہی تھی۔ ایسا کیوں تھا نیلم سمجھنے سے قاصر تھی۔

''ارے اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ تم نے اپنی کافی تک ختم نہیں کی۔'' نیلم بول اٹھی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ درگوش سے نظریں چراتی ہوئی بولی۔ درگوش بہ غور اس کو دیکھ رہا تھا پھر کچھ سوچ کر نیلم بولی۔

''اچھا۔ تم باہر جا کر میرا انتظار کرو۔ میں دو منٹ میں درگوش بھائی سے بات کر کے آتی ہوں۔''

طوسیہ نے اس کو گھور کر دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کے والد اسکو بے جا پابندیوں میں رکھتے ہیں۔ وہ تو میں ان سے زبردستی جنگ کر کے ایک ہفتے کے لے آئی ہوں۔ انہوں نے ہم کو کہیں گھومنے پھرنے کی اجازت بھی نہیں دی۔'' نیلم بولی۔

''ہوں۔'' درگوش نے سرہلایا۔''واقعی کافی حیرت انگیز بات ہے۔''

''آپ فکرمت کریں۔میں بہن ہونے کی وجہ سے اپنا فرض ضرور نبھاوں گی۔آپ میری شادی میں ضرور آئیں۔یوں بھی میری شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔''

''میرے آنے سے تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ ہنسی۔''دراصل میرا کوئی بھائی نہیں ہے اپنی شادی کا سارا انتظام مجھے خود کرنا ہے۔صرف ایک بوڑھی ماں ہے جو بیمار ہے ان کے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔''

''اوہ۔ویری سیڈ۔اگر کوئی کام وغیرہ ہے مجھے ضرور بتانا۔''

''سب کچھ مکمل ہے بھائی جان،بس آپ تشریف لے آنا اگر کسی کام کی ضرورت پڑی تو بتادوں گی۔'' نیلم خلوص دل سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔''

رات کو درگوش کی ڈیوٹی تھی لیکن وہ دماغی طور پر غیر حاضر تھا۔اس کا ذہن بہ دستور طوسیہ کے پراسرار رویے میں کھویا ہوا تھا۔نیلم سے تو اس نے اس کے گھر کا ایڈریس لے لیا تھا۔رات کے قریب دو بجے ایس ایچ او نے اپنے کمرے میں طلب کرلیا تھا۔وہ کافی بے دلی سے کمرے میں پہنچا تھا۔

ایس ایچ او سے کافی دوستانہ قسم کے مراسم تھے۔وہ دونوں اکثر مٹھائی (رشوت) مل بانٹ کر ہی کھاتے تھے۔

''کیا بات ہے آج آف کلر دکھائی دے رہے ہو۔نیند آرہی ہے۔'' ایس ایچ او فیاض نے اس کو غور سے دیکھا اور کہا۔

''بس یار کچھ تھکن سی ہے اور کچھ نہیں۔'' اس نے بات ہی اڑادی۔

’’ہوں۔ بات یہ ہے آصف تمہیں پندرہ دن کی لیو ملنے والی ہے۔‘‘

’’وہ کس خوشی میں؟‘‘ جواب حیرت سے دیا گیا۔

’’تمہارا نام اقبال بھٹی کی اس ٹیم میں شامل ہے۔ جو کہ سمندری ساحلوں کی نگرانی کرے گی جہاں سے اسمگلنگ کی جائے گی۔ ہر پندرہ دن کے بعد وہاں ایک ٹیم ڈیوٹی دے گی تاکہ دونوں کی کارکردگی اچھی ہو۔ اور کوئی کرپشن میں ملوث نہ ہو سکے۔‘‘

’’یار، یہ اقبال بھٹی کچھ زیادہ محبِ وطن نہیں۔‘‘ وہ چڑ کر بولا۔

’’شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تھوڑا پرانا ہو جائے گا تو خود ہی معمول پر آ جائے گا ویسے آدمی ایماندار ہے۔‘‘

’’ایماندار انسان کی پولیس میں کوئی جگہ نہیں اور اگر وہ پولیس میں بھرتی بھی ہو جائے تو اس کا حال جبران جیسا ہی ہوتا ہے۔‘‘

اس کی بات پر فیاض نے قہقہہ لگایا۔ دوسرے لمحے وہ سنجیدگی سے بولا۔

’’واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ جبران کی موت کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر تم یہ جو بات بول رہے ہو سب دوسروں کے سامنے مت کہنا۔‘‘

درگوش کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات تھے۔

’’اب جانے کی تیاری کرو۔ تمہاری جگہ فہد آ رہا ہے۔‘‘

’’یار، وہ تو ٹھیک مگر تم نے میرے سارے کھانچے مار دیے۔ اب اس ویرانے میں کیا جھک ماروں گا۔‘‘ اس نے منہ بنا کر کہا۔

’’ارے نہیں، بعض اوقات جنگل بھی منگل ہو جاتا ہے۔ اور تم اتنے سیدھے بھی نہیں ہو کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھو گے۔‘‘ فیاض کا لہجہ معنی خیز تھا۔ درگوش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس

سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

☆......☆......☆

ناگر اور اس کے ساتھی ایک ہی علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ صرف اپنے پراسرار باس کو جواب دہ تھا۔ ناگر نے زندگی میں کبھی بھی کسی سے ڈرنا نہیں سیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس پراسرار باس سے خائف ہو جاتا تھا جس کے احکامات اس کو صرف فون پر ہی ملتے تھے۔ نادر محل میں کھانے کی دعوت کے بعد باس نے ناگر اور اس کے ساتھیوں کو اس علاقے کا جائزہ لینے کا کہا تھا جہاں اس لانچ کو آنا تھا۔ جائزہ لینے کے بعد باس نے ان کو لمبی تان کر سونے کو کہا تھا کہ جب مال اترنا ہوگا انفارم کر دیا جائے گا۔ ناگر نے اپنے ساتھیوں کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ باس کے احکامات کس طرح ملتے ہیں۔ ویسے بھی اس کے ساتھیوں کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ باس کون ہے، بس وہ تو آم کھانے سے مطلب رکھتے تھے پیڑ گننا ان کے منشور میں نہ تھا۔ جب تک ان کو دوسرے کو احکامات موصول نہیں ہوئے تھے ناگر اور اس کے گروپ نے شہر میں چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دی تھیں جن سے ان کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ اس نادیدہ باس کا رعب ان پر یوں لگتا تھا کہ جیسے کہ وہ ہر وقت ان کے ساتھ ہو۔

ناگر اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھیوں کا ہنسی مذاق جاری تھا۔ کبھی کبھی ناگر بھی ایک لقمہ چھوڑ دیتا تھا جس سے اس کے ساتھیوں کے بلند و بانگ قہقہے چھوٹ پڑتے لیکن ناگر کی مسکراہٹ ان پر بھاری ہوتی تھی۔

''تم ہمیشہ ہی ہار جاتے ہو تو تاش کھیلتے ہی کیوں ہو؟'' جیک نے پپو کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں ہارتا، تم لوگ سالے بے ایمانی کرتے ہو۔'' پپو نے جل کر کہا۔

''یہ تو جھوٹ ہے۔'' ناگر نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر تم اکیلے بھی کھیلو گے ناں تو بھی ہار جاؤ

گے۔'' ناگر نے اپنے سامنے رکھے گلاس جس میں شراب موجود تھی اس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔اس کی بات کے جواب میں اس کے دونوں ساتھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔ جب کہ پٹھو کا منہ ہی بن گیا تھا۔ناگر کے لبوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی جس سے سامنے والا ہمیشہ ہی رعب میں آجایا کرتا تھا۔

''ناگر دادا۔ناگر دادا۔'' ٹونی نے ناگر کو مخاطب کیا۔

''ہاں بولو۔کیا کہنا چاہتے ہو۔'' ناگر نے مسکرا کر جواب دیا۔

''دادا۔نادر محل گئے کافی دن ہو گئے۔'' ٹونی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہاں اب کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔میں جانتا ہوں تم پیٹو ہو بڑے۔'' ناگر نے مسکرا کر جواب دیا۔اب ہنسنے کی باری پٹھو کی تھی لیکن جیک بھی کم نہ تھا۔ان دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھ کر ٹونی کافی چڑ گیا تھا۔

''جو بھی کھاتا ہوں اپنے پیسوں کا کھاتا ہوں۔تم لوگ کی طرح مفت خورا نہیں ہوں میں۔'' ٹونی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مفت خورا کس کو کہا ہے۔'' جیک نے آنکھیں دکھائیں۔

''ابے تجھ کو سالے۔بن مانس کی اولاد،خود کو دیکھ مفتے کا مال کھا کھا کر کیسا کپا ہو گیا ہے۔'' ٹونی نے سارا بدلہ اتارتے ہوئے جواب دیا۔اب تو ٹونی کی بات پر ناگر بھی ہنس پڑا تھا۔ جب کہ جیک لاجواب ہو کر برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔

''دادا! میں تو تمہارے کہنے پر اس بھوت محل میں گیا تھا ورنہ اگر باس نے بلایا ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔اور گروپ کو خیر باد کہہ دیتا۔'' پٹھو نے منہ بنا کر کہا۔

''اور پھر تمہاری لاش کسی گندی نالی میں ملتی۔اس گروپ کو چھوڑ دینے کا مطلب صرف

موت ہے، سمجھے تم۔'' ناگر کا لہجہ یکدم ہی سرد ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر سفاکی دیکھ کر تینوں ہی کانپ گئے تھے سارا خوشگوار ماحول یکدم ہی موت کے سناٹے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جیسے کہ کوئی مر گیا ہو۔

''دادا! میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''تو میں کون سا سیریس تھا۔'' ناگر نے مسکرا کر جواب دیا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر پپو سوچنے لگا، اگر بھیڑیا مسکرا سکتا تو ناگر جیسا لگتا۔

''میں اب تم لوگوں کو اہم بات بتانے والا ہوں۔'' ناگر ڈرامائی انداز میں ان تینوں کو دیکھنے لگا تھا۔

''کون سی بات استاد۔ بات پیسے کے فائدے کی ہو تو اچھا ہے۔'' ٹونی نے کہا۔

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' ناگر نے مسکرا کر کہا۔ ''لانچ میں جو بھی مال ہو گا اس میں سے باس کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔ باقی سارا مال ہمارا ہو گا، چاہے وہ مال ہیروں کی شکل میں ہو یا سونے کی شکل یا پھر کوکین کی شکل میں سب ہمارا ہے۔'' ناگر نے طویل سانس لے کر کہا۔

''کیا۔'' تینوں کے حلق سے بیک وقت نکلا۔

''پر وہ کیا چیز ہو گی جس کی باس کو ضرورت ہے؟'' تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''پتہ نہیں۔ جو بھی ہے لیکن ہے بہت قیمتی یہ باس نے ابھی بتایا نہیں۔ وہ بعد میں بتا دیں گے۔'' اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

درگوش نیلم کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا تھا لیکن وہ خالی ہاتھ نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ دو

خوبصورت سے پیکٹ بھی تھے۔ایک تحفہ طوسیہ کے لئے دوسرا نیلم کے لئے۔
نیلم کا گھر تین کمروں کے فلیٹ پر مشتمل تھا۔ کمرے زیادہ بڑے تو نہیں تھے مگر ہوادار ضرور تھے۔دروازہ نیلم نے ہی کھولا تھا اور درگوش کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر تحفوں کو دیکھ کر اس نے خفگی کا اظہار ضرور کیا تھا۔

''ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت ہے جبھی تو لایا ہوں۔''

''بہت مہنگے ہوں گے بھائی۔'' وہ مسکرائی۔

''میری بہن! تم بھی تو بہت قیمتی ہو۔'' درگوش نے پیار سے نیلم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔درحقیقت درگوش کو نیلم سے سگی بہنوں کی طرح محبت ہو گئی تھی کیونکہ اس کی کوئی بہن ہی نہیں تھی۔ ہمیشہ سے ہی اس کو بہن کی تمنا رہی تھی اس لئے جب نیلم نے اس کو بھائی کہا تو درگوش کو اپنی یہ تمنا پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
نیلم نے تحفے سنبھالے اور اس کو ایک کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرا ڈرائنگ روم تھا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے رازدارانہ لہجے میں طوسیہ کی بابت پوچھا تھا۔جس کے جواب نیلم ہنس پڑی اور بولی۔

''وہ۔میرے دوپٹے پر بیل لگا رہی ہے۔میں نے کل سے اس کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''یہ اچھا کیا۔اگر اس کو پتہ چلتا کہ میں آنے والا ہوں تو شاید وہ اپنے گھر چلی جاتی۔''

''بھائی یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔خیر یہ بتائیں کیا لاؤں آپ کے لئے۔''

"صرف ایک کپ کافی۔"

نیلم نے سر ہلایا اور جانے لگی تو درگوش نے اس کو روک لیا اور بولا۔

"یہ بتاؤ۔کل تم کو طوسیہ نے کیا بتایا؟"

اتنا سننا تھا کہ وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔

"کچھ بھی نہیں بھائی۔وہ تو اس موضوع پر کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔نہ جانے اس پر کس قسم کا دباؤ ہے۔"

"ہوں۔" چند لمحوں تک سوچنے کے بعد درگوش بولا۔"کیا تم اس سے میری ملاقات کروا سکتی ہو۔"

"ضرور۔" وہ بولی۔"میں کافی بنانے جا رہی ہوں اسے کسی بہانے سے یہاں بھیج دیتی ہوں۔"

"تمہاری امی۔"

"ان کی فکر مت کریں وہ اپنے کمرے میں آرام فرما رہی ہیں۔"

اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد طوسیہ کمرے میں داخل ہوئی اور دروازے پر ٹھٹک کر رک گئی۔اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی۔

"آپ۔آپ۔" اس کے منہ سے نکلا اور دوسرے پل اس کی نگاہیں از خود جھک گئیں۔

"کیا میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتا ہوں۔" درگوش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔اس نے ایک پل بھی درگوش کی سمت نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

"وہ اس لئے کہ میری چاہت آپ سے سچی ہے۔آپ سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔" درگوش نے اپنی بات کے جواب میں طوسیہ کے چہرے کو گلنار ہوتے دیکھا۔اس نے

صاف محسوس کیا تھا کہ شرم وحیا کی وجہ سے اس کی نگاہیں مزید جھک گئی ہیں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد درگوش نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی بات سن کر طوسیہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور کچھ سوچنے کے بعد وہ بولی۔

"درگوش صاحب! آپ نے شمع اور پروانے کو کبھی دیکھا ہے۔ پروانہ شمع تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر خود جل جاتا ہے۔ میں وہی شمع ہوں درگوش صاحب جس کے حصول میں آپ جل تو سکتے ہیں لیکن مجھ تک پہنچ نہیں سکتے۔"

"کیوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ میرا اور آپ کا نکاح نہیں ہو سکتا۔" درگوش نے چڑ کر پوچھا۔

"میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتی۔"

"سوال بھی تم نے ہی پیدا کیا ہے، طوسیہ اور جواب بھی تم ہی دو گی۔" درگوش نے کہا۔

"ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کی ہر بات کا جواب دوں۔" طوسیہ نے ضد کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی آؤ میرے پاس بیٹھو آ کر بتاؤ کیا بات ہے۔"

طوسیہ نے کچھ سوچا اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر صوفے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز سے بے چینی عیاں تھی۔

درگوش اس کو بغور دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"مجھ سے شادی کرنے میں کیا قباحت ہے۔"

"ہماری شادی ناممکن ہے۔"

"لیکن کیوں۔"

"مجھے اس کی تفصیل تو معلوم نہیں مگر اتنا ضرور پتہ ہے اگر میری شادی ہوئی تو وہ رات

میری اور میرے شوہر کی آخری رات ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" درگوش چونک اُٹھا۔

"ہاں۔" وہ اداسی سے بولی۔ "اس نے یہی کہا ہے۔"

"کس نے کہا ہے۔ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" درگوش نے چڑ کر کہا۔

"اسی نے جس نے میری پرورش کی۔ جس نے مجھے پروان چڑھایا۔"

"تمہارا مطلب بڑے سرکار سے ہے۔ مگر وہ تو تمہارا باپ ہے۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں۔ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس کی سگی اولاد ہوں۔" اس نے چلا کر کہا۔

طوسیہ کی بات پر کمرے میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا تھا کیونکہ وہ الفاظ ہی ایسے تھے کہ درگوش دنگ رہ گیا تھا۔ اتنی دیر میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دونوں نے چونک کر دیکھا تو چائے کی ایک ٹرے دکھائی دی۔ طوسیہ نے اُٹھ کر فوراً ہی اس ٹرے کو تھام لیا تھا۔ دروازہ ازخود بند ہو گیا۔ یہ نیلم کی ہی حرکت تھی وہ ان دونوں کو موقع دینا چاہتی تھی اس لئے وہ اندر نہیں آئی تھی۔ طوسیہ نے ایک کپ درگوش کے سامنے رکھا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"وہی جو سچ ہے۔ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں کون ہوں میرے ماں باپ کہاں ہیں مجھے علم نہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کیوں۔ جب تم کو ان سے جدا کیا گیا تو تم کہاں تھیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے یاد بھی نہیں۔"

"تو پھر تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔"

نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''میں یہ سب آپ کو کیوں بتاؤں؟''

''اس لئے کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ تمہاری پریشانی میری پریشانی ہے اس کو دور کرنا میرا فرض ہے۔'' درگوش کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ پھر وہ اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''شادی تو تمہاری میری ضرور ہو گی اور میں بہت جلد آؤں گا تمہارے بابا جانی سے تمہارا رشتہ لینے۔''

''ایسا غضب مت کرنا'' وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''وہ میری شادی ہرگز نہیں کریں گے۔ اس لئے تو انہوں نے مجھے مردوں سے دور رکھا ہوا ہے۔''

''لیکن کیوں۔''

''بس مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی ہوں۔''

''تم فکر مت کرو۔ اس گھٹن بھرے ماحول سے میں تم کو نجات دلواؤں گا۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔

''وہ کیسے۔'' اب کی بار طوسیہ بھی مسکرائی تھی۔

''تم کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔ جب بھی میں آواز دوں تم اس پر لبیک کہنا۔ مجھے دھوکا مت دینا۔'' طوسیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ قدرے توقف کے بعد درگوش نے پوچھا۔

''ایک بات بتاؤ۔ کیا تم کو میری محبت قبول ہے۔''

اس بات کا طوسیہ نے کوئی جواب نہ دیا تھا مگر اس کے گال شرم سے سرخ ہو گئے تھے اور نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اچانک درگوش نے ایک ایسی حرکت جو طوسیہ کے بالکل ہی

گمان میں نہ تھی جس سے اس کے گال اور سرخ ہو گئے تھے۔

درگوش نے آگے بڑھ کر طوسیہ کے دونوں ہاتھوں پر باری باری بوسہ دیا تھا جس سے طوسیہ کے اندر جلترنگ سے بج اُٹھے ہوں۔ایک خوبصورت احساس اس کو اپنے اندر دوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا جس کو شاید پیار کہتے ہیں۔

''میری جان! بہت جلد تم آزاد فضاؤں میں سانس لوگی۔یہ میرا وعدہ ہے اور میں بہت جلد بڑے سرکار سے تمہاری بات کروں گا۔''

''نن۔نہیں آپ کوئی اور راستہ نکالیں۔''

''چلو۔میں کچھ اور سوچوں گا۔دوبارہ ملاقات کب ہو گی؟''

''میری آزادی کے بھی دن یہی ہیں۔یہ نیلم کی ہی کوشش تھی کہ وہ مجھے یہاں لے آئی۔''

''تم پریشان نہ ہو۔تمہارے چہرے کی ایک مسکراہٹ کے لئے میں اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔''

اسی لمحے نیلم اندر داخل ہوئی تھی اور اس نے یہ جملے سن لئے تھے اور وہ شرارتی انداز میں مسکرا کر ان کی جانب دیکھنے لگی تھی۔جبکہ طوسیہ اور درگوش دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔

☆......☆......☆

یہ بھی اتفاق ہی تھا، نیلم کا ہونے والا دولہا بھی اس دنیا میں بالکل ہی اکیلا تھا البتہ اس کے واقف کاروں کی تعداد بہت لمبی تھی۔شادی کا پروگرام چونکہ نیلم کی طرف سے تھا اس لئے وقار کی طرف سے گنے چنے لوگ ہی مدعو کیئے گئے تھے۔

شادی کی تقریب کے دوران نیلم نے وقار سے درگوش کو ملوایا تھا۔وقار کافی سلجھا ہوا انسان معلوم ہوا تھا۔درگوش نے شادی میں نیلم کو کافی مہنگا اور قیمتی سونے کا سیٹ گفٹ دیا تھا جس کو

نیلم ہرگز لینے پر تیار نہ تھی مگر اس نے اس کو ایک بھائی کہہ کر نیلم کے حوالے کیا تھا۔شادی کی تقریب پانچ روزہ تھی۔ یوں بھی وہ پندرہ دن کی چھٹی پر تھا۔اقبال بھٹی کی مرتب کردہ ٹیم میں وہ بھی شامل تھا۔

ولیمے کی تقریب بھی ایک وسیع اور خوبصورت لان میں ہوئی تھی۔درگوش کافی دیر تک وقار کے پاس بیٹھنے کے بعد طوسیہ کو نیلم کے پاس سے اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ آیا تھا۔دونوں ہی خوبصورت کیاریوں کی طرف آ گئے تھے۔ہلکے میوزک نے ماحول کو اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔کیاریوں کے اندر جلتے ہوئے برقی قمقمے طوسیہ کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔

''آپ مجھے یہاں کیوں لے آئے۔''نیلم نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

''یونہی تم سے بات کرنے کے لیئے۔نہ جانے پھر کب تم سے ملاقات ہو۔''

''ہاں یہ تو ہے۔نہ جانے کب بڑے سرکار کا بلاوا آ جائے۔''اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور ان کیاریوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''ان کیاریوں کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو۔''اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''دیکھ رہی ہوں۔یہ روشنی کتنی بھلی اور پیاری لگ رہی ہے۔''

''روشنی تو ہمیشہ ہی بھلی اور پیاری ہوتی ہے۔''درگوش نے مسکرا کر جواب دیا۔

''صرف ان لوگوں کے لیئے جن کی زندگی میں اندھیرا نہ ہو۔''

درگوش بڑے ہی غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔اس طرح یوں دیکھنے پر وہ شرما گئی اور بولی۔

''اس قدر غور سے مت دیکھیں مجھے شرم آتی ہے۔''اس نے سر جھکا کر کہا۔

''دیکھ رہا ہوں۔اس لباس میں تم کس قدر خوبصورت لگ رہی ہو۔گلابی شرارے میں تم

بالکل پری معلوم ہوتی ہو۔" درگوش نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔اس کی بات سن کر طوسیہ کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ایک بات پوچھوں۔"

اسکی بات پر طوسیہ اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔کیوں تم بڑے سرکار کی اتنی قید و بند اور سختیاں برداشت کر رہی ہو؟" اس نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔"اس کھلی فضا میں سانس لینا بھی ایک نعمت ہے میرے لئے۔"

"تم فکر نہ کرو میں تم کو بہت جلد اس قید سے آزاد کروا دوں گا۔"

"مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔"

"اور میں اس بھروسہ کو توڑوں گا نہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر طوسیہ کو گلے لگا لیا۔طوسیہ کے لئے یہ عمل خاصا غیر متوقع تھا وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔اچانک اس کی نظر درگوش کے عقب میں جا پڑی اور اس نے جو کچھ دیکھا اس کو دیکھ کر اس کے حلق چیخ نکل گئی۔اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف دکھائی دینے لگا تھا۔اس کی چیخ پر درگوش نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی کیفیت کسی بھی طرح سے طوسیہ سے کم نہ تھی۔بس وہ یک ٹک اسی جانب دیکھے ہی جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

سامنے بڑے سرکار موجود تھے اور وہ کھا جانے والی نظروں سے طوسیہ کو گھور رہے تھے۔ طوسیہ کا حال بہت برا تھا۔اس کی کیفیت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے جیسی تھی۔خوف سے اس کا

جسم تھر تھرانے لگا تھا۔ درگوش بھی خود ٹپٹا گیا تھا کہ اس سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرے۔

ان کے ساتھ اور دو افراد بھی تھے جنہیں درگوش نہیں جانتا تھا۔ اب وہ صرف بڑے سرکار کی طرف سے کسی اہم ردعمل کا منتظر تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ خلاف توقع بڑے سرکار کی جیسے کیفیت بدلی ہو۔ اس کا چہرا ایکدم تبدیل ہوا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ بولا۔

''بابا، درگوش تم ادھر ہو۔ ارے۔ طوسیہ تم بھی یہاں ہو۔ میں خلاف توقع تم کو پورے ہال میں تلاش کر رہا تھا۔ نکاح میں تو میں شرکت نہ کر سکا مگر ولیمہ مجھے کھینچ لایا۔''

''جی۔ آپ نے اچھا کیا بابا جانی۔'' طوسیہ نے جواب دیا۔

درگوش خود بھی بڑے سرکار کے بدلتے ہوئے ردعمل سے پریشان تھا۔ اس کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پھٹ پڑنے کے بجائے وہ اتنا پرسکون کیوں ہے؟

''طوسیہ! تمہاری اس دوست اور اس کے شوہر کو تحفہ دینا ہے۔ آپ بھی آؤ انسپکٹر۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے ساتھ والوں سے مخاطب ہوا۔

''جاؤ بابا۔ گاڑی سے گفٹ نکال کر لے آؤ۔''

''کیا سوچ رہے ہو انسپکٹر۔'' بڑے سرکار کی آواز بڑی نرم اور مٹھاس سے بھرپور تھی۔ ''پہلے سوچا کہ طوسیہ کو لے کر بغیر کھانا کھائے نکل جاؤں گا۔ مگر تم کو دیکھا اور اپنا ارادہ بدل لیا۔''

''ذرہ نوازش ہے بڑے سرکار کی۔'' درگوش کو اور کوئی جواب نہ سوجھا۔

''چلو۔ ذرا گھوم کر آتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے درگوش کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہال میں آگے بڑھنے لگا۔ طوسیہ اور نیلم اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ طوسیہ کے چہرے پر خوف تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ہوئے کافی آگے تک نکل آئے تھے۔

”جانتے ہو آفیسر۔آگ سے کھیلنے والوں کے ہمیشہ ہاتھ ہی جلا کرتے ہیں۔“ بڑے سرکار نے اس کو دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب۔میں سمجھا نہیں آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔“

”نن۔نہیں بابا۔ہماری کیا اوقات آپ کو دھمکی دیں۔جب گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا ہے تو انگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ بڑے سرکار نے مسکرا کر کہا۔

”دیکھو بڑے سرکار، آپ کھل کر مدعا بیان کرو۔تو بہتر ہوگا۔“

”ہوں۔ایسا کرو۔تم وقت نکال کر ڈیرے پر آؤ پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔“

”ضرور بڑے سرکار، جب آپ حکم کریں۔تبھی حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

اس سے قبل وہ کچھ کہہ پاتے ان دونوں نے لوگوں کو کھانے کی میزوں کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ویٹروں نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا تھا۔

”لو۔بھئی کھانا شروع ہو گیا۔اب کھاتے وقت بات کریں گے۔“

بڑے سرکار اور وہ دونوں ایک ٹیبل پر جا بیٹھے۔ان کیساتھ آئے ہوئے دونوں لوگوں نے بڑے سرکار اور درگوش کے لئے کھانا لانا شروع کر دیا۔وہ دونوں جس ٹیبل پر تھے وہاں دوسرا کوئی بھی نہیں تھا۔یہ بہت خاص مہمانوں کے لئے لگایا گیا تھا۔ایسے تین اور بھی تھے۔جن پر دولہا کے جاننے والے بیٹھے ہوئے تھے۔کھانے میں بیف بریانی، بیف کڑاہی، تکہ فرائی اور سویٹ ڈش میں چار ڈشز موجود تھیں۔جن میں ربڑی کھیر، گاجر کا حلوہ، آئس کریم موجود تھی۔

”کھانا بڑا عمدہ کروایا ہے نیلم بیٹی نے۔“

”واقعی کھانا لذیذ ہے۔“ درگوش نے بھی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

بڑے سرکار کے ساتھ آئے دونوں ملازم اپنا کھانا لے کر دوسری طرف چلے گئے تھے۔

کھانے کے دوران بالکل ہی خاموشی رہی۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ بڑے سرکار زیادہ نہیں کھا رہے۔ بالکل ہر چیز کو تھوڑا تھوڑا چکھتے تھے۔ البتہ وہ سویٹ ڈشز سے انصاف کررہے تھے۔
"مچھلی کبھی کھائی ہے انسپکٹر؟" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ اس طرح کا بے موقع کا سوال سن کر وہ چونک پڑا۔ جواب تو دینا ہی تھا۔
"کھائی تو ہے مگر زیادہ نہیں۔ دراصل مجھے اتنی رغبت نہیں۔"
"ہوں۔ مچھلی کے شکار کا شوق ہے؟" انہوں نے اچانک ہی پوچھ لیا۔
"شکار۔" وہ چونکا۔
"ہاں بابا، مچھلی کا شکار۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔ اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا انہوں نے اس وقت مچھلی کے شکار کا ذکر کیوں چھیڑ دیا ہے۔ اس کے حساب سے اس کا موقع ہی نہ تھا۔
"ہے تو سہی۔ لیکن اتنا زیادہ نہیں۔"
"خوب۔ ایسا کرتے ہیں، ہم دونوں پرسوں رات مچھلی کے شکار پر چلتے ہیں۔ وہاں بات بھی ہوجائے گی اور شکار بھی اور بابا تم کو ڈیرے پر آنے کی تکلیف بھی نہیں کرنی پڑے گی۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"
"پکا۔" وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ "بات یہ ہے کہ میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا میں تم اور میرے خاص ملازم۔"
"ٹھیک ہے میں ضرور آؤں گا۔"
"میرے خاص ملازم مچھلی بھوننے کا کام کریں گے۔ تم اور میں بات چیت کرلیں گے۔"
"ایک بات اور کرنی ہے طوسیہ کے بارے میں۔" درگوش نے دل کڑا کرکے کہا۔ اس کی بات سن کر بڑے سرکار کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ ان تاثرات کو وہ کوئی

معنی نہیں دے سکا تھا۔

''کل پر رکھو۔رات کے سناٹے میں سکون سے تمہاری بات سنوں گا۔''

موقع محل اور ستارے بھی درگوش کے حق میں تھے۔موقع محل یوں کہ درگوش کو سرکاری طور پر چھٹیاں ملی ہوئی تھیں چونکہ بڑے سرکار نے طوسیہ کے سلسلے میں درگوش سے بات کرنے کی ہامی بھر لی تھی اس لئے وہ بہت خوش تھا۔اس کو یقین تھا کہ وہ طوسیہ کے رشتہ کو کبھی ناں نہیں کریں گے۔چنانچہ اس نے فوراً ہی بڑے سرکار کی طرف دوڑ لگادی تھی۔مغرب ہوتے ہی یہ دونوں شکار کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔وہ ایک لمبی سی وین تھی جس میں یہ لوگ روانہ ہوئے تھے۔ان دونوں کے علاوہ ان کے تین ملازم اور بھی تھے جنہوں نے وین میں سامان ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔

یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا تھا۔چونکہ ان کا رخ بونار کی ساحلی پٹی پر تھا اس لئے یہ سفر خاصا طویل تھا۔بونار کی پٹی یوں بھی خاصی ویران اور سنسان رہا کرتی تھی۔یہ کسی بھی طرح کا پکنک اسپاٹ نہ تھا۔اس کی وجہ مسافت تھی۔سمندر کے پانی کی بو اور پھر ٹھنڈی ہواؤں سے درگوش نے اندازہ کرلیا تھا کہ سفر اب اختتام کی جانب ہے۔

''لو بھئی آفیسر۔ہماری منزل قریب ہے اب۔''

''آپ یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں بھئی اکثر۔''

''جہاں تک میرا خیال ہے کہ یہ پکنک پوائنٹ تو نہیں ہے۔''

اس کی بات پر انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔اس کے بعد قہقہہ لگا کر بولے۔

''ارے بابا۔شکار کا جنون کی حد تک شوق ہے مجھے اس لئے اتنا دور آتا ہوں یہاں مچھلی

زیادہ ہوتی ہے۔''

''اور اس شوق میں آج میں بھی شامل ہو رہا ہوں۔''

''تم دیکھنا کتنا لطف آتا ہے۔''

جواباً درگوش نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑی کو ایک جگہ روک دیا گیا اور پھر وہ لوگ نیچے اتر آئے۔ یہ ایک کھلی سی جگہ تھی جس کے اردگرد گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ چاند کی دھیمی سی روشنی میں یہ جھاڑیاں اور درخت سائیں سائیں کرتے ہوئے فضا میں لہرا کر بے حد رومان پرور سماں باندھ رہے تھے۔

تھوڑے ہی فاصلے پر سمندر کی لہریں مدھم سا شور کرتی ساحل سے ٹکرا کر سمندر میں واپس اتر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ اتنا سحر انگیز تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے کھو سا گیا تھا۔بڑے سرکار کے ملازمین نے سامان وغیرہ اتارا۔اور سب سے ایمرجنسی لائٹس جلائی گئیں جن کی وجہ سے اردگرد کا ماحول روشن ہو گیا۔

''کیوں انسپکٹر بابا۔کیسا لگ رہا ہے۔''

''بہت ہی زبردست سحر انگیز۔''اس نے جواب دیا۔

جلد ہی ملازموں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی چھولداری نصب کر دی جس کے اندر فولڈنگ کرسیوں پر بڑے سرکار اور درگوش براجمان ہو گئے تھے۔

''تھوڑی دیر آرام سے بیٹھو۔چند قدموں کے فاصلے پر ایک ٹیلہ ہے جہاں ہم لوگ شکار کھیلیں گے۔''

پھر ملازموں نے ان دونوں کو کافی پیش کی جس نے کافی اثر کیا تھا۔جسم میں چستی سی دوڑنے لگی تھی۔

''یہاں شکار بہت ملتا ہے۔ہم جلد ہی شکار لے کر واپس آتے ہیں جب تک تم لوگ اس کو بھوننے کا بندوبست کرو۔'' اتنا کہہ کر بڑے سرکار اور درگوش آگے بڑھ گئے۔دونوں شکار کے سامان کے ساتھ جھاڑیوں سے نکل کر آگے بڑھے۔بڑے سرکار نے روشنی سنبھال رکھی تھی جس کی مدد سے وہ دونوں آگے بڑھ رہے تھے۔تھوڑے فاصلے پر واقعی ایک ٹیلہ موجود تھا۔دونوں چڑھ کر اس پر بیٹھ گئے۔سمندر کی لہریں اس کے نچلے حصہ سے ٹکرا رہی تھیں۔

''یہاں سمندر ذرا گہرا ہے۔اس لئے یہاں شکار بکثرت پایا جاتا ہے اور جلد لگ بھی جاتا ہے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنا جال سمندر میں پھینک دیا۔پھر وہ درگوش کی طرف گھوما اور اس کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں بابا۔اب بتاؤ۔تمہاری کیا چاہت ہے۔''

اس کی بات سن کر وہ چونک اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر طویل سانس لے کر بولا۔

''طوسیہ۔طوسیہ سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر انہوں نے سر ہلایا اور پھر سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''شادی کرنا بہت اچھی بات ہے مگر طوسیہ سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی انسپکٹر۔''

''کیوں۔کیا برائی ہے مجھ میں؟'' درگوش نے چڑ کر کہا۔بڑے سرکار نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔اور پھر طویل سانس لے کر بولا۔

''وہ۔وہ میری بیٹی نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' درگوش نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔حالانکہ یہ بات اس کو پہلے سے معلوم تھی۔طوسیہ نے اس کو بتا دیا تھا۔

''دراصل اس کا تعلق ایک قدیم شاہی قبیلے سے ہے۔وہ مجھے بے حد پراسرار طریقے سے

ملی تھی۔اس کی تفصیل کافی لمبی ہے۔طوبیہ کے باپ نے دم توڑنے سے قبل اس کو میرے حوالے کیا تھا اور مجھ سے عہد لیا تھا کہ اس کی شادی کسی ایسے انسان سے کروں جس کی رگوں میں بہت اعلیٰ خون دوڑ رہا ہو۔وہ کسی شاہی نسل سے ہو یا پھر وہ اس قدر دولت مند ہو کہ اس کی آنے والی دس نسلیں کھا سکیں۔" بڑے سرکار نے طویل سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔

"ارے یہ کس طرح کی شرط ہے؟" وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

"شرط تو عجیب سی ہے لیکن اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ اگر ایسے دونوں ہی انسان نہ ملیں تو میں اس کو کنوارہ ہی رکھوں۔"

"ارے۔اس کا باپ تو مر گیا اور کون سا اوپر سے واپس آ کر اپنی شرط کو پورا ہوتا دیکھے گا۔میں وعدہ کرتا ہوں اس کو بہت خوش رکھوں گا۔"

"بابا۔مجبوری ہے میری اس کا باپ ایک بہت بڑا ساحر تھا۔نہ جانے اس نے کون سا عمل کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا پورا کنبہ برباد ہو گیا صرف طوبیہ ہی بچی ہے۔اب میں اس شرط کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہوں۔" بڑے سرکار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اگر میں اس سے شادی کر لوں بھی کیا حرج ہے۔"

"حرج۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔"وہ اب بھی اپنے مرے ہوئے باپ کی شرط کے حصار میں قید ہے۔شاید اس کو تم سے محبت ہو گئی ہے۔لیکن تم سے ملنے کے بعد جب سے وہ گھر آئی ہے تب سے ہی سخت بیمار ہے۔اور مجھے خدشہ ہے کہ ملاقاتوں کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔" بڑے سرکار کا لہجہ غم ناک تھا۔یہ سن کر درگوش سناٹے میں آ گیا۔

"کک۔کیا وہ بیمار ہے؟"

"ہاں۔" انہوں نے طویل سانس لے کر کہا۔"میں اس کا علاج تو کروا رہا ہوں امید ہے

وہ جلد تندرست ہو جائے گی۔"

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" درگوش نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ سب تم کو اگر نہ بتاتا تو تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے۔ نہ ہی تم اتنے امیر ہو اور نہ ہی محکمے میں ایسی کوئی پوزیشن جس سے تم اس کے باپ کی شرط پوری کر سکو۔"

"لیکن میں دولت حاصل کر سکتا ہوں۔ اور اس کو پانے کے لئے کچھ بھی کروں گا۔ امیر بنوں گا۔ اتنا امیر کہ پھر آپ انکار نہ کر سکیں۔"

"بابا۔ یہ فلمی باتیں ہیں۔"

"نہیں۔ اگر میں چاہوں تو دولت کو بھرپور انداز میں حاصل کر سکتا ہوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ میں کامیاب بھی ہو جاؤں۔" درگوش نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر میں طوبیہ کے لئے تمہارا انتظار کروں گا۔"

"ایسا ضرور ہوگا۔ طوبیہ کے لئے میں سونے چاندی کے انبار لگا دوں گا۔"

اس کی بات سن کر بڑے سرکار نے اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ عین اسی وقت سمندر کے ڈوبے ہوئے جال میں ہلچل سی ہوئی۔

"لو بھئی، شکار تیار ہے۔ جال تو پھر بھی جال ہوتا ہے۔" بڑے سرکار نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

شکار سے واپسی پر درگوش کافی تھک چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گھر آتے ہی سو گیا تھا۔ سوتے ہوئے اس کو نہ جانے کتنی دیر گزری ہوگی کہ ایک عجیب قسم کی آواز سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ایک نقاب پوش اس کے سر پر کھڑا ہے

اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ اس کی جانب تھا۔ جس ہاتھ میں پستول تھا اس پر کسی پرندے کے نشان کا ٹیٹو موجود تھا جس کو درگوش نے دیکھ لیا تھا۔

"ہلنے کی کوشش کی تو اس کی چھ کی چھ گولیاں میں تمہارے جسم میں خالی اتار دوں گا۔" نقاب پوش نے سرد لہجے میں کہا۔

"کون ہو تم؟" درگوش نے ڈرے بغیر پوچھا۔ اس کی بات سن کر وہ ہنس پڑا۔

"موت کا کوئی نام نہیں ہوتا انسپکٹر۔" اس کے لہجے سے سفاکی عیاں تھی۔

"تو مجھے مارنے آئے ہو۔" درگوش نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ ارادہ تو میرا یہی ہے۔"

"مارنے والے باتیں کر کے وقت ضائع نہیں کرتے میرے دوست۔ تم کو اسی وقت میرا قصہ تمام کر دینا تھا جب میں سویا ہوا تھا۔" اتنا کہہ کر درگوش نے آگے بڑھ کر بجلی کی سرعت سے اس نقاب پوش کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ نقاب پوش اس افتاد کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر جا گرا۔ اس سے قبل وہ ریوالور کو اٹھا پاتا۔ درگوش نے سرعت سے آگے بڑھ کر ریوالور اُٹھا لیا

"اب بتاؤ کون ہو تم؟" درگوش نے پستول اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے درگوش پر ہی چھلانگ لگا دی تھی جس کے نتیجے میں پستول درگوش کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر جا گرا۔ اب وہ دونوں بیڈ کی جگہ فرش پر آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر کی سعی کے بعد اس کی گردن درگوش کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ اس نے اس کی گردن کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کسی طرح اس کا نقاب اُتار سکے لیکن وہ بڑا کائیاں تھا۔ درگوش کی ہر کوشش کو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ناکام بنا رکھا تھا۔

دفعتاً اس نے درگوش کو اپنے سر کے پچھلے حصہ سے ٹکر ماری جو کہ سیدھی جا کر ناک پر لگی تھی۔ درگوش نے چیخ کر اس کی گردن چھوڑ دی تھی۔اتنی ہی مہلت کافی تھی کہ وہ بجلی کی سرعت سے کمرے کے دروازے سے باہر تھا۔وہ بھی اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن وہ کوئی چھلاوا ہی معلوم ہوتا تھا۔اسقدر تیزی سے وہ غائب ہوا کہ درگوش اس کا نشان بھی نہ پاسکا تھا بس اس کو وہ ٹیٹو یاد تھا کہ جو کہ اس کے ہاتھ پر کھدا ہوا تھا۔نہ جانے یہ کس کی حرکت تھی لیکن جس کی بھی حرکت تھی،اس کے ارادے نیک نہیں تھے۔درگوش نے اس بات کو دبا دینا ہی مناسب سمجھا تھا ورنہ آفس میں اس کی کافی سبکی ہونے کا اندیشہ تھا۔

☆......☆......☆

ناگر کی ٹیم کے سارے لوگ آج اس کے گھر پر جمع تھے۔ضرور کوئی خاص بات تھی جو ابھی تک کسی پر عیاں نہیں تھی۔رات کا کھانا ناگر کی طرف سے ہی تھا اور کھانے کی وافر مقدار دیکھ کر توجیک کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''واہ دادا۔آپ نے تو کمال کر دیا۔کیا آپ کا ولیمہ ہے آج؟'' جیک نے بڑے ہی بھونڈے انداز میں کہا۔

''جب بھی کرو گے۔اُلٹی ہی بات کرو گے۔دادا کو ولیمہ کی کیا ضرورت جب دودھ بازار میں وافر مقدار میں دستیاب ہو تو دکان کھولنے کی کیا ضرورت۔''ٹونی نے بائیں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔اس کی بات سن کر سب ہنس پڑے تھے۔جب کہ جیک کا منہ بن گیا۔

''منہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔تھوڑا چھوڑ کر سارا کھانا تم کھا سکتے ہو۔'' ناگر نے مسکرا کر کہا۔

''دادا! میں کیا جن ہوں؟''

”نہیں بیٹا۔ تُو جن نہیں ہے جن تیرے آگے بہت چھوٹی چیز ہے۔ تو دیو ہے دیو۔“ ٹونی نے پھر سے اس کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر کمرے میں بے ساختہ قہقہے گونجنے لگے تھے جبکہ جیک کا برا سا منہ بن گیا تھا۔

”جن بھوتوں کی باتیں چھوڑو ہمیں آج نادر محل جانا ہے۔“ ناگر نے سنجیدگی سے کہا۔

”ن ن۔ نادر محل۔“ پنٹو کے منہ سے نوالہ نکلنے لگا تھا۔ ”وہ کیوں، پھر کوئی مصیبت آن پڑی ہے کیا۔“

”نہیں، کیا یاد نہیں باس آخری ٹائم میٹنگ رکھی تھی۔“

”ہاں یاد تو ہے۔“ پنٹو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ اس کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔“

”ہوش میں تو ہے۔ کیا بک رہا ہے۔ یہ ہماری کارروائی ہوگی میرا اندازہ ہے کہ اتنا بڑا ہاتھ ہم نے کبھی نہیں مارا ہوگا پھر ناگر کے وہی پرانے دن لوٹ آئیں گے۔“

”اوہ۔ اس کا مطلب، یہ کھانا نہیں ایک چارہ ہے۔“ پنٹو نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”چارہ، کیا مطلب؟“ سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

”یہ چارہ ہی تو ہے دادا جو قربانی کے وقت بکرے کو کھلایا جاتا ہے۔“

”اوہ۔“ ناگر نے ہونٹ سکیڑے۔ ”تم غداری کرنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو۔ شہر کے نالوں میں اتنی جگہ موجود ہے ایک لاش اور اس میں پھینکی جا سکے۔“ ناگر نے سرد لہجے میں کہا۔

”ن ن۔ نہیں دادا۔ میں بغیر شادی کے مرنا نہیں چاہتا۔ مرتے وقت بھی عجیب لگے گا۔“

اس کی بات سن کر سب ہی ہنس پڑے تھے۔ ناگر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”بات قربانی کی نہیں، ہم سب کو بس مل جل کر کام کرنا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کما سکیں بس۔“

”ہم تو تیار ہیں استاد۔“ جیک اور ٹونی نے یک زبان ہو کر کہا۔

”شاباش۔ ابھی تک ہم نے آسان ہی کام کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کام مشکل ہو لیکن جتنا رسک اتنا ہی مال۔“

”مال ملے تو میں تیار ہوں دادا۔“ پپو نے کہا۔

”پھر جلدی جلدی سے کھانا ختم کرو۔ رات کے دو بجے تک الرٹ رہنا ہے۔ او کے۔ اس ساحل پر ایک لانچ آنے والی ہے۔ اس لانچ سے مال وصول کر کے نادر محل تک پارسل کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے استاد ہم ریڈی ہیں۔“ ٹونی نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے استاد بریانی میں نمک زیادہ ہے۔“ پپو نے کہا۔

”سالے، دو دفعہ کھا چکا ہے اور پھر بھی کہتا ہے نمک کم ہے۔“ ٹونی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر سب ہنس پڑے تھے۔

☆......☆......☆

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ ساحل سے دور ان درختوں کے درمیان قدرتی طور ایک جگہ موجود تھی جس کو مچان کے طور پر یوز کیا جا سکتا تھا۔ انسپکٹر درگوش بھی اس ٹیم میں شامل تھا جو کہ ساحلی علاقوں کی نگرانی کے لئے ڈی ایس پی اقبال بھٹی نے بنائی تھی تا کہ سمندر کے ساحلوں پر ہونے والی اسمگلنگ کی روک تھام کی جا سکے۔ ساحل کے گرد چکر کاٹنے کے بعد درگوش اپنے ساتھیوں کیساتھ اسی جگہ آرام کرتا، تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ پٹرولنگ بھی کیا کرتے تھے۔

اس قدرتی مچان کو کھوجنے والا اکرام تھا یہ حوالدار تھا اور کافی تیز طرار اور پھرتیلا تھا۔ اس ٹیم میں انسپکٹر آصف درگوش کے ساتھ دو افراد اور بھی شامل تھے۔ ایک سب انسپکٹر شیر علی اور

دوسرا شکیل احمد وہ سب انسپکٹر تھا۔

ان سب سے میں زیادہ خوش مزاج شیر علی تھا جس کی زبان پر دنیا جہاں کے تمام قصے موجود ہوتے۔ وہ ہر بات کے ساتھ منہ سے کوئی نہ کوئی گالی ضرور نکالتا تھا۔ ایسا وہ جان بوجھ کر نہیں کرتا تھا کچھ لوگ عادت سے مجبور ہوتے ہیں اس طرح کی کیفیت اس کے ساتھ بھی تھی۔ اس کی دلچسپ اور پر مزاح باتوں سے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

شکیل احمد نہایت سریس اور متلون مزاج قسم کا انسان تھا۔ سنجیدگی اس کے بشرے سے گویا ٹپکتی تھی۔ ڈیوٹی خاصی بوریت کا شکار تھی۔ ڈی ایس پی کے خدشات ابھی تک سوائے وہم اور دماغی خلل کے سوا کچھ نہ تھے۔ شیر علی تو بعض اوقات اول فول بکنے لگتا تھا۔ اس کی باتوں پر لوگ خوب ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔

اس ٹیم کے کسی گروپ کی طرف سے ابھی کوئی ایسی خبر نہیں ملی تھی جس کو کوئی اہم کارنامہ کہا جائے۔ اس وقت بھی یہ لوگ قدرتی مچان پر ہی بیٹھے ہوئے پتے کھیل رہے تھے۔ چھوٹی سی سرچ لائٹ کی روشنی میں ان کے سامنے پتے بکھرے ہوئے تھے۔

''اب بتاؤ ہے کوئی بہن کا۔ جو میرے کنگ کو مارتا ہے۔'' شیر علی نے حسب عادت گالی دیتے ہوئے کہا۔

''اس میں کون سی بڑی بات ہے، ابھی لو۔'' درگوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ڈرامائی انداز میں ایک پتا پھینکا جس کو دیکھ کر شیر علی کا منہ لٹک گیا۔

''اس کی ماں۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔''

''یار، تم بغیر گالی کے کوئی بات نہیں کر سکتے؟'' شکیل احمد نے تنگ کر کہا۔

''کر تو سکتا ہوں مگر۔ بہن، عادت جو ہو گئی ہے۔''

”پھر گالی۔ یاد رکھو۔ گالی دینے والے سے نیکی کا فرشتہ کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔“ شکیل احمد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ممکن ہے بات اور بڑھ جاتی کانسٹیبل اکرام نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

”رستم، پر ایک بات یاد آئی۔ رستم زیادہ طاقتور تھا یہاں سہراب۔“

”باپ سالا پھر بھی باپ ہوتا ہے۔ اولاد، بہن۔۔۔ کتنی بڑی ہو جائے باپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ شیر علی نے حسبِ عادت اپنی روش کے مطابق کہا۔ اس کی گالی سن کر اکرام کا منہ پھر بن گیا لیکن اس نے اب کی بار کچھ نہ کہا۔

”ایک بات ہے۔“ اکرام نے کہا۔

”وہ کیا؟“ درگوش بے ساختہ بول اُٹھا۔

”جب رستم اور سہراب کا مقابلہ ہوا تو تو سہراب کا وار بھاری رہا۔ رستم تو اسی وقت ہی جان سے جاتا اگر وہ ایک دن کی مہلت نہ مانگتا۔“

”یار، بات تو واقعی دل کو لگتی ہے۔“ شکیل احمد نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”اب خود ہی سوچ لو۔ باپ زیادہ طاقتور تھا یا بیٹا۔“

”لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ شیر علی نے کہا۔“ وہ سالا رستم ہرگز اپنے بیٹے سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ بات اسکو قطعی معلوم نہ تھی کہ سہراب اس کا خون جگر ہے۔ وہ قدرتی طور پر اس مقابلے کے حق میں نہیں تھا اور اس کا دل جنگ کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ ماں کی آنکھ نہ ہو جاتی۔“ شیر علی نے حسبِ عادت کہا۔

”پھر بھی۔ یہ ایک ایسا۔“ اکرام نے بولنا چاہا۔

”شش۔“ یکا یک درگوش نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ”خاموش۔ میں کچھ آوازیں سن رہا ہوں“

ان کی زبانوں کو گویا بریک لگ گیا۔ مچان پر سناٹا سا چھا گیا تھا اسی وقت اکرام دبے لہجے میں بولا۔

"کیسی آوازیں سر۔"

"کسی کے چلنے اور بولنے کی آوازیں۔" درگوش نے سرگوشی کی۔ "رات کے اس پہر کون لوگ ہیں جو یہاں چہل قدمی کر رہے ہیں۔"

اس کی بات سن کر دوسرے ساتھیوں نے بھی غور کیا۔ واقعی کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں تھیں جو سنائی دے رہی تھیں جو کہ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ انسپکٹر درگوش کے چہرے پر سنسنی دوڑ گئی۔ گویا ڈی ایس پی کی بات ٹھیک تھی کہ ساحل پر غیر قانونی سرگرمیوں کا اندیشہ ہے۔

انسپکٹر کا دماغ بڑی ہی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے ان کے ارادے اچھے نہیں تھے چنانچہ اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔

"یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔ کوئی بھی حرکت مت کرنا صرف واچ کرتے ہیں۔"

جلد ہی آنے والے سامنے آ گئے۔ یہ تین لوگ تھے جن میں دو کے قد لمبے تھے۔ ایک کا نا ٹا تھا اور کاٹھی میں کسی دیو سے کم نہیں تھا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں سرچ لائٹس تھیں جن کی روشنی میں وہ تینوں ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چاند اپنی آب و تاب پر تھا۔ چاندنی میں وہ تینوں صاف دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ ان کی شکلیں دیکھنے سے قاصر تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہی وہ ساحل کے قریب پہنچ گئے۔

"کیا یہ سالے شکار کرنے آئے ہیں۔" شیر علی نے خیال ظاہر کیا۔

"شکار ہاتھوں سے تو نہیں ہوتا میرے دوست۔ کیونکہ یہ لوگ خالی ہاتھ ہیں۔" درگوش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ۔ ہاں واقعی۔" شیر علی خجل ہو گیا۔ "تو پھر یہ ماں کے یہاں کرنے کیا آئے ہیں؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔ اتنی رات کو کوئی ساحل پر لوڈو تو نہیں کھیلنے آ سکتا۔"

"سر جی۔ اب نیچے اتریں۔"

"ہاں۔ بالکل اب اترنا ہی ہو گا۔"

چاروں باری باری آہستہ سے نیچے اتر آئے تھے پھر وہ درختوں کا سہارا لے کر آگے بڑھے۔ اس معاملے میں نہایت ہی احتیاط کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی وہ تینوں ان کو ساحل پر کھڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ کسی انجن کے تیز شور سے درگوش اور اس کے ساتھیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ انجن کی آواز کسی لانچ کی تھی جو کہ آہستہ آہستہ اس ویران ساحل کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے بے چینی کے عالم میں گھڑی پر نظر ڈالی پھر بے خیالی میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔ راہداری سے گزرنے کے بعد اب وہ ایک کھلی جگہ پر آ چکا تھا۔ کافی دور جا کر اب وہ ایک خاص مقام پر آ کر رک گیا۔ اب وہ اسی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے تین دفعہ تالی بجائی، فوراً ہی اس سے دو قدم کے فاصلے پر ایک خلا نمودار ہو گیا۔ اس خلا میں سوائے تاریکی کے کچھ اور نہ تھا لیکن وہ بے دھڑک ہو کر اس تاریکی میں نیچے اتر گیا۔ وہ سیڑھیاں تھیں جن پر

وہ قدم رکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ پانچویں سیڑھی پر پہنچا خود بہ خود ہی چاروں طرف روشنی کی بوچھار ہوگئی۔ اب سب کچھ صاف اور واضح دکھائی رہا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک میز اور کرسی موجود تھی۔ دیوار پر ایک کمپیوٹر سکرین نصب تھی اور ساتھ میں ایک مائیک بھی موجود تھا۔ میز پر ایک بورڈ نصب تھا جس میں بے شمار قسم کے رنگ برنگی بٹن نصب تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کچھ بٹن دبائے اور فوراً ہی سکرین روشن ہوگئی۔

اس کے انداز میں بڑی ہی بے چینی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی اہم مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہو۔ سکرین پر ایک ہال نما کمرے کا منظر واضح ہو چکا تھا جس میں چار افراد دکھائی دے رہے تھے جو کہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

''بس آج کی رات اہم ترین رات ہے، میرے گھوڑے کمزور ضرور مگر مجھے یقین ہے کہ یہ میدان مار لیں گے۔ میری سالوں کی محنت رنگ لانے والی ہے اور کامیابی میرے قدم چومے گی۔'' وہ آپ ہی آپ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا پھر اس نے کرسی کھسکائی اور سکرین پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اپنے ساتھیوں کو کور کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

درگوش اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستعد تھا۔ اس کی نظریں ان تینوں پر جمی تھیں۔ اور پھر لانچ ساحل سے آ لگی تھی۔ پھر اسی لانچ سے کسی نے ٹارچ سے تین بار روشنی جلائی تھی۔ ساحل پر موجود ان تین میں سے ایک نے وہی عمل جواباً دہرایا تھا۔ اسی وقت لانچ سے کسی نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔

''سمندر بہت گہرا ہے۔''

''سمندر کی گہرائی کا اندازہ صرف ایک ماہر تیراک ہی لگا سکتا ہے۔'' ساحل پر تینوں میں سے ایک بولا۔ غالباً یہ ان کے کورڈ ورڈز تھے جس سے یہ لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

''او کے۔ مال ریڈی ہے۔'' لانچ والے کی آواز میں اطمینان تھا۔

یہ سن کر وہ تینوں آگے بڑھے۔ درگوش نے اپنے ساتھیوں کو کسی بھی قسم کی حرکت سے منع کر دیا تھا۔ جلد ہی لانچ سے ایک وزنی سا باکس اتار گیا جسے فوراً ہی درختوں کے قریب لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ پھر وہ لانچ وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ تینوں عجلت میں آگے بڑھے۔

''ہالٹ۔ خبردار ہلنے کی کوشش مت کرنا۔'' درگوش نے کڑکدار آواز میں کہا۔ تینوں حیرت کے مارے اچھلے اور پھر ساکت ہو گئے۔

''خبردار۔ تم تینوں زیرِ حراست ہو۔ اگر ہلنے کی کوشش کی تو میرے ریوالور کی ساری گولیاں تم لوگوں کے جسموں میں چھید کر چکی ہوں گی۔''

☆......☆......☆

پھر وہ تینوں چاروں اطراف سے گھیر لئے گئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں پولیس بھی آسکتی ہے۔ ناگر کا دماغ بڑی ہی تیزی سے اس ناگہانی صورتحال سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے جیک کو نادر محل میں چھوڑ کر کافی عقلمندی سے کام لیا تھا۔

''ہمارا جرم کیا ہے؟'' ناگر نے پرسکون لہجے میں دریافت کیا۔

''اتنی رات کو کیا اپنے ابا کی شادی میں آئے تھے سالے۔'' شیر علی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ہم کمپنی کے ورکر ہیں اور اپنا مال وصول کر رہے ہیں۔'' ناگر کو کوئی اور جواب نہ سوجھا۔

''بہت خوب۔ کون سی کمپنی ہے تمہاری ہے اور کس قسم کا مال ہے؟'' درگوش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”نیشنل فشنگ کمپنی۔ اور ہم مچھلیوں کی فیڈ وصول کر رہے تھے۔ اس باکس میں فیڈ ہے۔“

”کیا ورک آرڈر ہے تمہارے پاس؟“

ناگر نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال دیا۔ اگلے پل ہی اس کا ہاتھ باہر بھی نکل آیا تھا اور پھر اس نے وہی ہاتھ فوراً جھٹک دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہاں ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ سفید رنگ کا گاڑھا سا دھواں پھیل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائے۔ دھواں بہت تیزی سے ان کے گرد پھیل گیا تھا۔ درگوش اور اس کے ساتھیوں کی ناک بہت تیزی سے جلنے لگی تھی۔ درگوش کے ساتھیوں نے فوراً ہی اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیے تھے۔

دھواں چھٹا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

”بہن۔۔۔ بھاگ گئے دھوئیں کا بلاسٹ کر کے۔“ شیر علی نے گالی دیتے ہوئے کہا۔

”بھاگ گئے لیکن مال چھوڑ کر۔“ شکیل احمد نے باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شکیل! تم ان کے پیچھے جاؤ وہ لوگ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس باکس میں کیا ہے۔“ درگوش نے سنجیدگی سے کہا اور جیب سے ٹارچ نکال لی۔

شکیل احمد درگوش کی بات سن کر اس کی طرف دوڑ گیا تھا جس طرف ان لوگوں نے دوڑ لگائی تھی۔

باکس نہایت ہی عجیب وضع قطع کا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ باکس نہیں کوئی گولڈن رنگ کا تابوت ہے۔ باکس کے اوپر ایک سونے کے سانپ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے کسی ناسمجھ آنے والی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اور نہایت ہی موٹا سا تالا اس باکس پر موجود تھا۔

”یہ نشان۔“ شیر علی نے دماغ پر زور دار دیتے ہوئے کہا۔

’’بالکل ویسا ہی ہے۔جیسا کہ مصری اہراموں میں بنا ہوتا ہے۔‘‘اکرام نے مسکرا کر کہا۔

’’تم کو کیسے پتہ۔‘‘شیر علی نے پوچھا۔

’’میں نے ممی فلم میں دیکھا تھا۔‘‘اکرام نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

’’رکو۔‘‘درگوش کچھ سوچتا ہوا بولا۔’’اس کو کھول کر دیکھتے ہیں کہ اندر ہے کیا۔‘‘

’’ہاں سر یہ ٹھیک ہے۔‘‘اکرام نے کہا۔

اچانک درگوش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔’’اکرام!شیر علی تم دونوں مچان سے جا کر وائرلیس سیٹ لے کر آؤ۔ہیڈ کوارٹر میں انفارم کرنا ہے۔‘‘

ان دونوں کے جانے کے بعد درگوش کے ریوالور سے تالے پر فائر ہوا اور تالا ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میں اس باکس کو کھول دیا۔اس کے باکس کے اندر جو کچھ بھی تھا اس کو دیکھ کر درگوش کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

دھوئیں کے بم والی حرکت ناگر نے کی تھی تاکہ پولیس کے چنگل سے بچ کر نکلا جا سکے۔ ناگر کے ساتھ ٹونی اور پنٹو بھی شامل تھے۔یہاں کا چپہ چپہ انکا دیکھا بھالا تھا۔ان کو اچھی طرح معلوم تھا کسی گڑبڑ کی صورت میں کیا کرنا ہے چنانچہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی وہ تینوں ایک دوسرے آملے تھے۔

’’دادا!گڑبڑ ہوگئی۔اب کیا ہوگا۔‘‘ٹونی نے کہا۔

’’میں تو سمجھ رہا تھا کہ سب کچھ آسان ہوگا۔لیکن وہاں تو پولیس پہلے سے موجود تھی۔اب ہم کو جلد از جلد نادر محل پہنچ کر جیک کو وہاں سے نکالنا ہے۔‘‘

’’میرے خیال سے کسی حرام زادے نے مخبری کی ہے۔‘‘ٹونی نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔" ناگر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پولیس پر ہاتھ اُٹھانے کا انجام بہت برا ہو گا دادا۔"

"مجھے پولیس سے ذرا برابر بھی خوف نہیں۔ مجھے انجام معلوم ہے ایک نہ ایک دن پولیس کی گولی۔" ناگر نے سرد لہجے میں کہا۔

"مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں اب چلو۔"

جیسے ہی وہ تینوں نادر محل کے اس ہال میں داخل ہوئے ایک رعب دار آواز ہال میں گونجی۔

"مال کہاں ہے؟"

ہال میں موجود چاروں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے جبکہ جیک ایک کونے میں کرسی پر بیٹھا ان تینوں کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مال پکڑا گیا باس، کسی نے مخبری کر دی۔"

"کیا۔" باس کی چیختی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"یہی ہوا ہے باس۔" ناگر نے کانپتے ہوئے کہا۔

جواباً چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد باس کی سرد آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی جس کو سن کر ناگر کو اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"الو کے چرخوں۔ مجھے مال سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن جو چیز مجھے اس سے درکار تھی اب بھی وہ میری ضرورت اول ہے۔ وہ چیز اب پولیس کی تحویل میں ہے اب چاہے جو کچھ بھی ہو۔ وہ مجھے درکار ہے ورنہ تم چاروں کی لاشیں گدھ کھا رہے ہوں گے۔ سمجھ گئے تم لوگ۔"

"جج۔ جی باس۔" ناگر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''باس! وہ ہے کیا چیز۔'' جیک کے منہ سے نکل گیا۔

''سانپ کی مورتی۔ مجھے سانپ کی مورتی درکار ہے۔''

''سانپ کی مورتی۔'' ناگر کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

اس باکس میں ہیرے جواہرات، موتی، سونا اور سونے سے بنی ہوئی دوسری اشیا بھی موجود تھیں جن کا تعلق بھی سونے کی برادری سے تھا۔ ایک چیز سب سے نمایاں تھی جو کہ دیکھنے میں سب سے زیادہ منفرد اور نمایاں تھی وہ ایک سونے کا سانپ تھا۔ درگوش کو نہ جانے کیا سوجھا اس نے ہاتھ بڑھا کر اس سانپ کو اُٹھا لیا۔ جیسے ہی وہ سانپ اس کے ہاتھ میں آیا اسے یوں لگا کہ جیسے اس نے بہت ہی کوئی گرم چیز ہاتھ میں پکڑ لی ہو کہ وہ سانپ کی مورتی میں زندگی کے آثار ہوں۔ سانپ کی وہ مورتی وزن میں بھی کافی بھاری تھی۔ اس سانپ کی آنکھوں کی چمک کافی تیز تھی۔ لازمی طور پر ان آنکھوں کی جگہ ہیرے تھے۔ درگوش نے ادھر ادھر دیکھتے ہی فوراً ہی اس سونے کا سانپ کو اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ بہت جلد امیر ہونے کے لالچ نے درگوش سے یہ کام کروا دیا تھا۔ اس سانپ کے علاوہ اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس کو فوری چھپا سکتا تھا۔ اس کے ساتھی بھی واپس آ چکے تھے۔ ان کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو کہ درگوش کی ہوئی تھی۔

''سالا۔ بہن۔۔۔۔ کروڑوں کا مال ہے۔'' شیر علی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''یہ سونے کی اسمگلنگ ہے سر۔'' شکیل احمد نے درگوش کو کہا۔

''میری طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔ شاید اس دھویں کے اثرات ہیں میرا سر چکرا رہا ہے میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''اوہ۔ سر آپ ضرور جائیں۔ کہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' شکیل نے کہا۔

''نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ تم لوگ یہاں کے معاملات دیکھو ہیڈ کوارٹر میں انفارم کرواور اضافی فورس منگوالو تا کہ پورے علاقے کی ناکہ بندی کی جا سکے۔'' درگوش نے سنجیدگی سے کہا۔

''سر، لانچ والوں کو جانے دے کر ہم نے غلطی کی۔'' اکرام نے کہا۔

''اس وقت صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔'' درگوش نے جواب دیا۔ ''اگر معلوم ہوتا کہ معاملہ اس قدر اہم ہے تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ یوں بھی لانچ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی صورت میں بہت ممکن تھا کہ وہ لوگ اس بکس کو سمندر میں پھینک دیتے۔''

''بات تو ٹھیک ہے سر۔''

''تو پھر میری ہدایات پر عمل کرو۔ میں چلا۔''

اتنا کہہ کر درگوش جھاڑیوں کی جانب لپکا جہاں اس کی موٹر سائیکل چھپی ہوئی تھی۔ دراصل اب اس سونے کے سانپ کی مورتی کو سنبھال کر رکھنا تھوڑا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''سالی۔ اسقدر ملائی ہے میری تو نیت پھسل رہی ہے۔ کیا خیال ہے تھوڑی ملائی مار لی جائے۔'' شیر علی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا۔ درگوش نے اس کو اچھی طرح سے چیک کیا ہوگا۔ اگر بکس میں کچھ کم ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' اکرام نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بات تو مناسب ہے۔ نیت تو میری بھی پھسل رہی ہے۔'' شکیل نے کہا۔

''سالو۔ دیکھ لو لائف سیٹ ہو جائے گی۔'' شیر علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''بکو مت۔ ہیڈ کوارٹر میں انفارم کرتے ہیں۔''

☆......☆......☆

”ہاں سانپ کی مورتی۔“ باس کی آواز ابھری۔ ”اس بکس میں جو کچھ بھی ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے باس۔ہم کوشش کرتے ہیں۔“ ناگر نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”کوشش۔“ باس کی آواز تیز ہوگئی۔جس کو سن کر ناگر کو نہ جانے کیوں ایسا لگا کہ ویرانے میں بھیڑیا غرایا ہو۔ایک سرد سی لہر تھی جو کہ ناگر نے اپنے اندر دوڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔خوف کا احساس اسے ستانے لگا تھا۔

”کوشش کا لفظ صرف کمزوروں کی ڈکشنری میں اچھا لگتا ہے۔یاد رکھو تمہارے لئے آخری موقع ہے ورنہ اب تم میری نہیں موت کی آواز سنو گے اب تم لوگ جا سکتے ہو۔“

ناگر سمیت سب ہی سناٹے میں آگئے تھے۔پھر وہ چاروں باہر آگئے تھے۔

”میرے ساتھ صرف جیک یہاں رکے گا۔باقی تم لوگ واپس چلے جاؤ۔“

”کیوں دادا۔“ جیک حیرت سے بولا۔ ”کیا ہم یہاں جھک ماریں گے۔“

”ابے گدھے۔میں اس جگہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں جہاں وہ باکس اترا تھا۔“

”استاد۔کیا تم ہوش میں ہو۔وہاں جانے کا مطلب موت ہے۔“۔پنچو نے کہا۔اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”دادا۔تم ہوش میں تو ہو۔مرنے کا ارادہ ہے۔“ ٹونی کے لہجے میں تشویش تھی۔

”موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔“ ناگر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم باس کو نہیں جانتے ہو۔“

”یہ تو غلط ہے دادا۔ہم نے پوری کوشش کی تھی اس مشن کے لئے۔“ جیک نے احتجاج کیا۔

”مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔آؤ میرے ساتھ۔اب ہم کو اسی جگہ واپس چلنا

ہے جہاں ہم نے وہ باکس چھوڑا تھا۔'' ناگر نے سنجیدگی سے کہا۔

''لگتا ہے۔آج زندگی کا آخری دن ہے۔'' جیک بڑبڑایا۔اس کی بات سن کر ناگر نے صرف اس کو گھورنے پر اکتفا کیا تھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔کچھ ہی دیر میں وہ دونوں اسی جگہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے وہ باکس چھوڑا تھا۔تمام راستے انہوں نے کافی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس جگہ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔دور دور تک خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ پولیس وہ باکس لے کر جا چکی ہے۔

''دادا۔پولیس مال لے کر چمپت ہوگئی۔'' جیک نے کہا۔

''دیکھ رہا ہوں۔'' ناگر نے سر ہلایا۔

عین اسی وقت ناگر جھکا اور زمین سے اس کوئی چیز اٹھائی۔فوراً ہی اس نے اس چیز پر ٹارچ سے روشنی ڈالی تو یہ کسی نوجوان کی تصویر تھی۔ہنستی ہوئی مسکراتی ہوئی تصویر۔بے خیالی میں اس نے تصویر کو پلٹ دیا۔

دوسری طرف سیاہ روشنائی سے ایک تحریر موجود تھی۔''طوبیہ کے لئے۔درگوش۔''

☆......☆......☆

سونے کے سانپ کی مورتی بڑی ہی صفائی سے اندر کی گئی تھی درگوش کی طرف سے پھر وہ احتیاط کے پیش نظر وہاں سے نکل بھی آیا تھا۔اس نے اپنے فلیٹ کی بیل بجائی پھر فوراً ہی دروازے پر دستک دے ڈالی۔دروازہ کھولنے والا ایک نوکر تھا جس کو درگوش نے چند دن ہوئے رکھا تھا۔اس کا نام اکبر تھا۔

''اتنی دیر کیوں ہوئی دروازہ کھولنے میں۔'' درگوش نے قدرے غصے سے کہا۔اس کی بات سن کر اکبر حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔اور پھر فوراً ہی بولا۔

''درگوش بابو۔ ایک منٹ ہوا دروازہ کھولنے میں۔ اور آپ کے پاس اپنی چابی بھی تو ہے۔''
اس کی بات سن کر درگوش گڑبڑا گیا۔ واقعی بدحواسی میں اس سے غلطیاں سرزد ہو رہی تھیں۔
''اوہ یار، میں چابی بھول گیا تھا۔'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔
''آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ چائے بنادوں کیا؟'' اکبر نے کہا۔
''نہیں۔ طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، بس ذرا تھکاوٹ ہے۔ اگر کافی ہو جائے تو اچھا رہے گا۔''
''ضرور۔ ابھی لایا۔''

کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ لاک کیا اور قمیض کے اندر سے سونے کے سانپ کی مورتی نکال لی۔ اس نے غور سے اس مورتی کو دیکھا۔ کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا سانپ یقیناً خالص اور قدیم سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی مالیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ سانپ کی آنکھوں میں موجود ہیرے انمول ترین معلوم ہوتے تھے۔ بے ساختہ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ سانپ کی اس مورتی کو ٹھکانے لگا کر وہ طوسیہ کو حاصل کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ بڑے سرکار طوسیہ کا رشتہ اس کے حق میں قبول کر لیتے۔

درگوش کافی دیر تک اس مورتی کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ جیسے اس مورتی میں حرکت ہوئی ہو۔ لیکن وہ مورتی ویسے ہی بے جان تھی۔ اپنے اس احمقانہ احساس پر وہ خود ہی مسکرا اٹھا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک اُٹھا۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر اس کو الماری میں رکھا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازے پر اکبر کافی لے کر کھڑا تھا۔ اس نے کافی اس وصول کی اور دروازہ بند کر دیا۔ کافی پینے کے بعد وہ کافی دیر تک اس سانپ کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ ایک بہتر مستقبل کے خیال سے اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ طوسیہ کے

بارے میں ہی سوچنے لگا۔تھا اچانک اس کو ایسا لگا کہ اس کے سامنے طوسیہ موجود ہے اس نے سفید رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔

''تم اس وقت اور میرے گھر پر۔'' درگوش نے حیرت سے کہا۔

''میں آپ کے دل میں رہتی ہوں تو کیا آپ کے گھر میں نہیں آسکتی؟'' طوسیہ نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں نہیں، یہ دل بھی تمہارا ہے اور میرا گھر بھی۔'' درگوش نے خالص رومانوی انداز میں کہا۔

''تو آپ مجھے اس گھر کب میں لائیں گے؟'' طوسیہ نے اٹھلا کر کہا۔

''بہت جلد۔میں بڑے سرکار سے تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔'' درگوش مسکرایا۔اس کی بات سن کر طوسیہ کا چہرا شرم سے گلنار ہو گیا تھا۔

''کیا میں تم کو چھو سکتا ہوں۔تمہارے مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لوں۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔جواباً طوسیہ نے کچھ نہیں کہا بس سر جھکا لیا۔درگوش آگے بڑھا جیسے ہی اس نے اس کو چھونے کی کوشش کی اسی پل وہ غائب ہو گئی۔اب وہاں کوئی نہ تھا۔گویا درگوش اپنے خیالوں میں ہی طوسیہ سے باتیں کر رہا تھا۔اپنے اس خیال پر از خود مسکرا اُٹھا اور پھر وہ اپنے آپ بڑبڑایا۔''وہ وقت دور نہیں جب تم خیالوں میں نہیں۔حقیقت میں میری دلہن بن کر میرے سامنے ہو گی۔''

☆......☆......☆

طوسیہ اب خاموش سی رہنے لگی تھی۔اس کی خدمت کے لئے گھر میں ایک نوکرانی کا انتظام کیا گیا تھا۔اس کا نام کچھ بھی رہا ہو لیکن طوسیہ اس کو آپا کہہ کر بلاتی تھی۔

اس کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔اس کا شوہر شراب اور جوے کی لت کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔کرائے کا گھر تھا کب تک مالک مکان برداشت کرتا، بہت جلد ہی اس نے اسے نکال دیا۔چنانچہ مراد کے توسط اس کو یہاں نوکری مل گئی تھی۔آپا کو یہاں آ کر بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ اب چھت بھی میسر تھی اور روزگار بھی۔وہ طوسیہ کا بہت خیال رکھتی تھی چند ہی دنوں میں اس کی عادتوں سے اس نے واقفیت حاصل کر لی تھی۔نیلم کی شادی کے بعد سے ہی طوسیہ میں کافی تبدیلی آ چکی تھی جس کی وجہ سے آپا کو بہت زیادہ تشویش لاحق تھی۔طوسیہ نے اس کو کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اپنے دل کی بات وہ کہہ دے۔

دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ پڑی تھی۔اسی وقت آپا کمرے میں داخل ہوئی۔

"بی بی۔آج کیا بناؤں کھانے میں۔"

"کچھ بھی اپنی پسند سے بنا لو۔" اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"وہ تو روزانہ ہی بنا رہی ہوں۔آج آپ بتاؤ۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تو آج بھی خود ہی بنا لو۔مجھ سے مت پوچھو۔" طوسیہ نے بیزاری سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے، میں کباب اور دال چاول بنا دیتی ہوں۔"

"اچھا۔" طوسیہ نے سر ہلایا۔

"بی بی۔آپ کے کپڑے بھی پریس کر دیتی ہوں آپ نہا کر تازہ دم ہو جاؤ۔" آپا نے کہا۔

"نہانے کو رہنے دو۔" طوسیہ کے انداز میں بدستور بیزاری تھی۔

"میں نہلا دوں۔" آپا نے بڑے ہی پیار سے کہا۔اس کی بات سن کر طوسیہ نے اس کی طرف بڑے ہی غور سے دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

’’اب یہ بھی کرو گی۔‘‘

’’تو کیا ہوا۔‘‘ آپا نے جواب دیا۔ ’’آپ کا ہر طرح سے خیال رکھنا میرا فرض ہے۔‘‘

’’تم کپڑے لے آؤ۔ میں خود ہی نہا لوں گی۔‘‘

’’میرے ہوتے ہوئے آپ پریشان نہ ہوں۔‘‘ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ’’آج میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے نہلاؤں گی۔‘‘

طوسیہ کچھ نہ بولی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کپڑے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان کو بیڈ پر رکھ کر مسکرا کر بولی۔ ’’چلیں۔‘‘

’’اُفوہ۔ آج تم نے خوب ضد پکڑی ہوئی ہے۔‘‘ طوسیہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

’’آپ کو دو دن سے بجھا ہوا دیکھ رہی ہوں، میرا دل دکھ رہا ہے۔ نہانے کے بعد آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔‘‘ آپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

غسل خانے میں داخل ہو کر طوسیہ قدرے جھجک کر بولی۔ ’’آپا! تم جاؤ۔ میں خود ہی نہا لوں گی۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ آپا اطمینان سے بولی۔ ’’میں نے مشورہ دیا ہے تو میں ہی پورا کروں گی۔‘‘

پھر آپا نے اس کو اپنے ہاتھوں سے بے لباس کیا تھا طوسیہ کے چہرے پر شرم رقص کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے بدن کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آپا نے اس کے سراپے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر بولی۔

’’بہت خوش نصیب ہو گا وہ۔‘‘

’’کون؟‘‘ طوسیہ چونک گئی

’’وہی۔ جس کی تم دلہن بنو گی۔ کتنا حسین اور سبک ہے تمہارا جسم جیسے کہ سنگ مرمر کی کوئی

مورت ہو بے داغ۔" وہ بولتی ہی چلی گئی۔

اتنا سننا تھا کہ طوسیہ کے سامنے درگوش کا سراپا آ گیا۔ وہی درگوش جس نے اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بھی اس کو چاہنے لگی تھی۔ دوسرے ہی پل اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہنس کر بولی۔

"ارے آپا، تم تو شاعری کرنے لگیں۔ داغ تو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنی پیٹھ اس کی طرف گھما لی۔ آپا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی، گردن کی طرف ایک گول سرخ نشان تھا جو کہ چمکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ یہاں خون جم گیا ہو۔

"دیکھا تم نے۔" وہ سیدھی ہو کر بولی۔

"یہ نشان کیسا ہے؟"

"پیدائشی کہہ لو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چاند میں بھی داغ ہے۔" آپا نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں عورت ہو کر تمہارے بے مثال حسن کی شیدائی ہو گئی ہوں۔ اور اگر کسی مرد نے تم کو دیکھ لیا تو وہ بیچارا پاگل ہو جائے گا۔"

"باتیں مت بناؤ۔ یوں بھی کوئی مرد میرے نصیب میں نہیں ہے۔" طوسیہ نے پیار سے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ایسا کیوں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس کا لہجہ غمزدہ تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں مرد ذات کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں۔"

”یہ تو ایک فضول سی بات ہے۔“ وہ اس کے جسم پر پانی ڈالتے ہوئے بولی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، نیلم کی شادی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یہاں بھی آچکا ہے۔ بابا نے ہم دونوں کو ایکساتھ دیکھ لیا تھا بس اس دن سے انہوں نے مجھ پر پابندی لگا دی۔ میں نہ کہیں جاسکتی ہوں نہ کسی سے مل سکتی ہوں۔ ویسے بھی شروع سے انہوں مجھ پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔“

”اس میں تمہاری ہی بھلائی ہوگی وگرنہ بڑے سرکار تو تم جان چھڑکتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر طوسیہ کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

”وہ کیسا دکھتا ہے۔“ آپا نے رازداری سے پوچھا۔ اس کی بات سن کر طوسیہ جیسے کہیں کھوسی گئی۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔

”بچپن میں، میں نے سنڈریلا کی کہانی پڑھی تھی۔ سنڈریلا پر ایک شہزادہ عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ شہزادہ بہت خوبصورت تھا۔ بس ویسا ہے وہ۔“

اس کی بات پر آپا مسکرانے لگی تھی۔

”اس کی کوئی تصویر ہے۔“

”ہاں اس نے اپنی تصویر کا وعدہ تو کیا تھا مگر بابا کے آجانے کے بعد سب چوپٹ ہو گیا۔“

”اگر تصویر ہوتی تو میں ضرور دیکھتی۔“

یہ سن کر طوسیہ مسکرائی اور بولی۔

”میرا سب کچھ تو دیکھ چکی ہو۔ دل میں بھی جھانک لو۔ وہ نظر آجائے گا۔“

☆......☆......☆

ساحل پر ملنے والی تصویر اور اخبار میں چھپنے والی تصویر بالکل ایک ہی تھی۔ جس کو دیکھ کر

ناگر اچھل پڑا تھا۔

ہوا یوں کہ اس دن کے بعد ناگر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر والے اڈے پر واپس آ گیا تھا لیکن وہ دن رات اسی سوچ میں رہتا کسی طرح سونے کو حاصل کر لے۔ اسی طرح وہ سارا دن شہر کے تھانوں کے چکر لگاتا رہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سراغ مل جائے کہ وہ باکس کس پولیس پارٹی نے قبضہ میں لیا تھا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک تھانے کے سامنے بنے ہوئے ایک ہوٹل میں گھس گیا تھا کیونکہ بھوک کا احساس بڑی ہی شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک میز پر جم گئیں جہاں ایک بڑے میاں بیٹھے اخبار میں گم تھے۔ بڑے میاں کی عمر ساٹھ سال تھی۔ ان کے آگے کھانا رکھا ہوا تھا جو کہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

ناگر نے کچھ سوچ کر اسی طرف قدم بڑھا دیے۔

"کیا۔ میں یہاں میں بیٹھ سکتا ہوں۔"

انہوں نے چونک کر اخبار ہٹایا اور ناگر کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر بولے۔

"میاں! لیٹنے کے لئے گھر ہوتا ہے ہوٹل نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر اخبار میں گم ہو گئے۔

"لگتا ہے۔ بہرا معلوم ہے۔" ناگر زیر لب بڑبڑایا۔

"میں تشریف رکھنے کا کہہ رہا ہوں حضرت۔" ناگر نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی بات پر انہوں نے پھر ناگر کی طرف دیکھا۔

"میاں۔ شرافت کا لیبل ہر کوئی چہرے پر لگا کر تھوڑی گھومتا ہے وہ تو کردار سے پتہ لگتا ہے۔"

ناگر کافی زچ ہونے لگا تھا۔ اچانک اس کی نظر بڑے میاں کی کان کی مشین پر پڑی جو کہ

کان سے ہٹی ہوئی تھی چنانچہ ناگر نے آگے بڑھ کر وہ مشین واپس انکے کانوں میں لگا دی۔اس پر وہ کافی شرمندہ ہوئے تھے۔

”میاں! بیٹھو۔میں معافی چاہتا ہوں آپ کو شرمندگی ہوئی۔دراصل مجھے احساس نہیں ہوا کہ مشین اب کان میں نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ناگر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔اب اس کی نظریں ویٹر کو تلاش رہی تھیں۔

”میاں کس کو ڈھونڈ رہے ہو۔“

”ویٹر کو حضرت۔“

”ارے میاں! کھانا تمہارے سامنے ہے۔شروع ہو جاؤ۔اس میں ویٹر کو بلانے کی کیا ضرورت۔“بڑے میاں مسکرائے۔

”نہیں،نہیں۔آپ کھائیں میں اپنا منگوا لوں گا۔“

”میاں!ایک بات کان کھول کر سن لو۔“بڑے میاں کا لہجہ سخت ہو گیا۔”کھانا نہ تمہارا ہوتا ہے نہ میرا۔یہ نصیب کا ہے۔جس دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہے وہی کھائے گا۔“

”آپ نے بجا فرمایا۔چلیں پھر شروع کریں۔پھر اور منگوا لیں گے۔“ناگر نے جلدی سے کہا۔انہوں نے اخبار فوراً ایک طرف رکھ دیا اور کھانا کھانا شروع ہو گئے۔کھانے کے دوران بڑے میاں نے ناگر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میاں،یہ چوٹ کیسی ہے تمہارے ماتھے پر۔“

چوٹ پر ناگر کو یاد آیا کہ بچپن میں جب پہلا جرم کیا تھا تو یہ چوٹ اس کا تحفہ تھی۔

”وہ حضرت،بچپن کی ہے یہ چوٹ۔“ناگر نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ اچھا۔“

’’آپ اتنی دیر سے کھانا نہیں کھا رہے تھے۔‘‘ ناگر نے بڑے میاں سے پوچھا۔
’’دراصل اخباروں میں خبریں ہی اتنی چٹ پٹی ہوتی ہیں کہ دھیان ہی نہیں رہا۔اب دیکھو ناں اسمگلر بھاگ گئے سونا گرفتار ہو گیا۔‘‘
ناگر کے کان کھڑے ہو گئے۔’’جی۔میں سمجھا نہیں۔‘‘
’’ارے میاں حیرت ہے۔تم اخبار بھی نہیں پڑھتے تو نیوز چینل بھی نہیں دیکھتے ہو گے۔‘‘ بڑے میاں کے لہجے میں حیرت تھی۔
’’حضرت۔وقت ہی نہیں ملتا۔‘‘ ناگر نے ٹھنڈی سانس بھری۔’’اب تو ویسے بھی وقت کم ہی رہ گیا ہے۔‘‘
’’تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔‘‘ بڑے میاں نے تاسف سے گردن ہلائی۔’’برکت ہی کہاں رہی اب۔ہمارے دور میں جدید سہولیات نہیں تھیں لیکن برکت بہت تھی۔ایک کماتا تھا دس کھاتے تھے۔اور آج دس بھی پورے نہیں۔دن اور رات تو یوں گزر جاتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔‘‘ بڑے میاں نے لمبی تقریر جھاڑ دی تھی۔ناگر نے سوچا بزرگوار کافی باتونی معلوم ہوتے ہیں۔اس سے مدعے کی بات کرنے کی ضرورت ہے۔
’’بالکل درست۔آپ سونے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔‘‘
’’بھئی پہلے تم کھانا کھا لو۔پھر دیکھ لینا۔‘‘
’’میں صرف سرخی دیکھوں گا۔‘‘ اتنا کہہ کر اس نے اخبار میز پر پھیلا دیا۔اخبار میں خبر کے ساتھ اس ساری ٹیم کی تصاویر اور ان کے نیچے ان کے نام بھی موجود تھے۔پھر وہ درگوش کی تصویر اور اسکا نام دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

درگوش کی آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ چکا تھا۔اس کو طبیعت میں کچھ بوجھل پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ویسے بھی وہ زیادہ دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا۔نیند کے ہچکولے لیتے ہوئے اس کو اکبر پر بہت زیادہ غصہ آیا تھا کہ اس نے اسکو نیند سے کیوں بیدار نہیں کیا۔پھر وہ ہمت کر کے اُٹھ بیٹھا اور پھر دروازے کی جانب دیکھ کر اس کو یاد آیا کہ رات میں وہ لاک کر کے سویا تھا۔پھر اس صورت میں وہ اسکو کیسے اُٹھاتا۔پھر وہ ہمت کر کے اُٹھا اسی لمحے اس کو سانپ کی مورتی کا خیال آیا۔وہ فوراً ہی الماری کی طرف لپکا۔دوسرے ہی لمحے اسکو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔اسے ایسا لگا کہ اس کے ارمانوں کا تاج محل زمین بوس ہو گیا ہو۔اس کی وہ حالت تھی کہ جیسے جسم میں جان نہ رہی ہو یا وہ خود کسی پتھر کی مورت میں بدل گیا ہو۔

الماری خالی تھی۔وہ سونے کا سانپ اس الماری میں نہیں تھا۔کہیں سے بھی اس کو ایسے آثار نہیں ملے جیسے کہ کوئی اس کمرے میں آیا ہو۔اس نے پورے کمرے کی تلاشی لے ڈالی لیکن اس سونے کے سانپ کی مورتی کو نہ ملنا تھا اور نہ ہی وہ ملی۔اب وہ مایوس ہو چلا تھا۔

خیالات کی دنیا سے وہ اس وقت باہر آیا جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔دستک کی آواز سن کر وہ چونک اُٹھا۔

”کون؟“

”میں ہوں۔اکبر۔“

”اوہ اچھا۔“اتنا کہہ کر اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر اکبر کی نگاہوں میں حیرت دوڑ گئی لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا لیکن درگوش اس کی نگاہوں میں مچلتی ہوئی حیرت کو بھانپ گیا تھا۔جیسے وہ کہہ رہا ہو۔”رات کسی سے کشتی لڑی تھی کیا۔“

”تم جاؤ میرے لئے ناشتہ بناؤ۔میں نہا کر آرہا ہوں۔“ درگوش نے اس کی نگاہوں کو پڑھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”جج۔جی۔میں اس لئے آیا تھا کہ آپ ناشتہ کیا کروگے۔“

”کچھ بھی بنالو۔بار بار پوچھامت کرو۔“ یہ کہہ کر درگوش غسل خانے کی طرف بڑھا تھا۔ اکبرا بھی اسی جگہ جما ہوا تھا۔اس کو کھڑا دیکھ کر درگوش جاتے جاتے رک گیا۔

”کیا بات ہے۔“

”درگوش بابو۔کمرا سیٹ کردوں۔“

”نہیں۔شکریہ تم جاؤ میں کرلوں گا۔“ درگوش نے نرم لہجے میں کہا۔

درگوش نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔نہا کر بڑی حد تک وہ تازہ دم ہوگیا۔اب اس کا ذہن بڑی ہی تیزی سے اس مورتی کی گمشدگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔اسی الجھن کو لے کر اس نے جلدی جلدی کمرا سیٹ کیا اور ایکبار پھر وہ الماری کی جانب بڑھا۔پھر جیسے ہی اس نے الماری کا پٹ کھولا۔اور وہ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

ناگر نے ہوٹل میں بڑی تفصیل سے اس خبر کو بڑھا تھا۔اس باکس سے برآمد ہونے والی تمام چیزوں کی مکمل تفصیلات اس نیوز میں موجود تھی۔وہ تفصیل پڑھ کر چونک گیا تھا چنانچہ بڑے میاں سے جان چھڑا کر وہ فوراً ہی باس سے رابطہ کرنے کے لئے بے چین تھا۔اپنے اور ساتھیوں کی طرح وہ بھی اپنے نادیدہ باس سے ناواقف تھا۔رابطہ کے لئے گھر میں ایک چھوٹا ٹرانسمٹیر موجود تھا جس سے وہ باس سے رابطہ کیا کرتا تھا۔اگر باس کو خود رابطہ کرنا ہوتا تو وہ موبائل پر کال کرتا لیکن یہ نمبر ایسا ہوتا تھا جس کو کبھی ٹریس نہیں جا سکتا تھا۔

اس نے بتائی ہوئی مخصوص فریکوئنسی ملادی۔کافی دیر کی دردسری کے بعد آخر کار باس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا بات ہے۔اوور؟''

''باس! میں آپ کو کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔اوور۔'' ناگر کے انداز میں شکایت تھی۔

''اپنا انداز درست کرو۔مجھے ہزاروں کام ہوتے ہیں۔میں اتفاق سے ادھر نکل آیا تو تم سے بات ہوگئی ورنہ تم اس ٹرانسمیٹر سے اپنا سر ہی پھوڑ لیتے۔اوور۔'' باس کی قدرے بیٹھی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''سوری باس۔اوور۔''

''چلو معاف کیا۔اب بولو۔کیا کہنا چاہتے ہو۔اوور۔'' باس نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

''باس! اس مورتی کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔اوور۔'' ناگر نے آہستہ سے کہا۔

''تو تم یہ بتانے کے لئے مجھے بے چین تھے؟ اوور۔'' باس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

''نن۔نہیں باس۔'' جلدی سے بولا۔''وہ دراصل اخبار میں، میں نے اس خبر کے متعلق پڑھا ہے۔اوور۔''

''وہ تو ہر کسی کو معلوم ہے۔اس میں کون سی بڑی بات ہے۔اوور۔'' باس نے بولتے وقت شاید برا سا منہ بنایا تھا۔

''لیکن باس، میرے پاس دوسری خبر ہے۔اوور۔'' ناگر کا لہجہ ڈرامائی ہوگیا۔

''وہ کیا۔'' باس نے جلدی سے کہا۔''یاد رکھو بات کام کی ہو۔ورنہ۔اوور۔'' باس نے باقی

کا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”باس! اخبار میں مسروقہ چیزوں کی تفصیل ہے۔ لیکن اس میں اس سونے کے سانپ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اوور۔“

”کیا؟“ باس چلا اُٹھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔ اوور۔“ باس نے چلاتے ہوئے کہا۔ اس کے چلانے سے ناگر یکدم ہی سٹپٹا گیا۔

”مم۔ میرا مطلب ہے کہ اس باکس میں اس سانپ کی مورتی کو پہلے سے اُڑا لیا گیا ہے۔ یہ کام درگوش کے سوا اور کسی کا نہیں ہوسکتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے۔ اوور۔“

”درگوش۔ اوور۔“ باس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی باس، ہم نے ساحل کی تلاشی لی تھی۔ اوور۔“

”پھر کیا ملا وہاں سے۔ اوور۔“ باس کی آواز ناگر کے کانوں میں پڑی۔

”ساحل پر ایک تصویر ملی جو کہ درگوش کی ہی ہے جس پر کسی طوسیہ نام کی لڑکی کا نام لکھا ہے۔ اوور۔“

ناگر کی بات پر خاموشی چھا گئی۔ کافی دیر کے بعد باس کی بھرائی ہوئی آواز ناگر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ اب تم جاؤ میں خود اس معاملے کو دیکھتا ہوں کہ یہ درگوش کیا بلا ہے۔ اوور اینڈ آل۔“

☆......☆......☆

سونے کے سانپ کی مورتی الماری میں ہی موجود تھی اور اس کی آنکھیں اپنے مخصوص انداز میں چمک رہی تھیں۔ درگوش کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ وہ مورتی الماری میں نہیں تھی اور پھر واپس اسی جگہ کیسے آگئی۔ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ مورتی مل جانے کی

اس کو بیحد خوشی تھی۔ اس سوال کے جواب نے اسکو بہت زیادہ الجھا دیا تھا۔ چنانچہ جب وہ رات کو اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو بہت زیادہ خاموش خاموش تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی خاموشی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھے کہ آج بھی اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔

"ارے آپ آرام کرتے۔ آپ آئے کیوں۔" اکرام نے مسکرا کر کہا۔

"رت جگا صحت تباہ کر دیتا ہے سالا۔" شیر علی نے ٹکڑا لگایا۔

"یار، گھر میں بھی بوریت ہی ہوتی ہے۔" درگوش نے دھیرے سے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر تو سر جی اس کا ایک حل ہے۔ بوریت کو بھگانے کا۔" شکیل احمد نے مسکرا کہا۔

"وہ کیا۔" شیر علی اور اکرام نے یک زبان ہو کر کہا۔

"سر آپ کب تک ملازم کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاؤ گے۔ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔"

اس کی بات سن کر درگوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسکے خیالوں میں یکدم ہی طوسیہ کا چہرا گھومنے لگا تھا جس کے حسن کے حصار میں وہ قید ہو چکا تھا۔

"بالکل ٹھیک۔ جس گھر میں چاندی عورت نہ ہو وہ گھر گھر نہیں جہنم ہوتا ہے سالا۔" شیر علی مسکرایا۔

"چھوڑو ان فضولیات کو۔ یہ بتاؤ باکس کا کیا رہا۔" درگوش نے پوچھا۔ "کیونکہ میرے جانے کے بعد مجھے بالکل علم نہیں کہ کیا ہوا۔"

"سر، وہ سارا سونا سرکاری تحویل میں جا چکا ہے۔ اس کی رپورٹ ہیڈ کوارٹر میں آئی جی صاحب تک پہنچ چکی ہے اور سارے میڈیا میں آپ کے چرچے ہیں۔"

"ارے۔ میں تو لاعلم تھا۔"

"سر، پوری دنیا کو معلوم ہو گیا ہے۔ اب تو ہر جگہ آپ ہی کے چرچے ہیں۔" اکرام نے کہا۔

”میں آرام ہی کرتا رہا تھا اس لئے مجھ علم ہی نہیں ہوا۔“ درگوش نے بات بنائی۔
”بہر حال ایک انکوائری بیٹھ چکی ہے کہ یہ سونا آیا کہاں سے اور کس کو ڈلیور ہونا تھا بہت جلد ہی اصل مجرم سامنے ہونگے۔“ شکیل نے مسکرا کر کہا۔ ابھی درگوش اس بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک عجیب سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ آواز سیٹی سی مشابہت رکھتی تھی۔ پھر اس نے جو کچھ دیکھا وہ کافی حیران کن اور خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ درگوش کی نگاہ بے خیالی میں مچان کی جانب اُٹھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کی ہوائیاں اُڑ گئیں۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔
مچان کی طرف کا منظر ہی ایسا تھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

☆......☆......☆

آپا نے جس طرح اس کے حسن کی تعریف کی تھی وہ منظر بار بار اس کی آنکھوں میں لہرا رہا تھا۔ کیا میں واقعی بہت حسین ہوں، کیا یہی وجہ ہے کہ بابا نے مجھے سب سے چھپا کر الگ تھلگ رکھا ہوا ہے؟ کیا اس ڈر سے مجھے کوئی اُڑا لے جائے گا؟ کیا میں اسی طرح سات پردوں میں چھپی رہوں گی؟ اسی طرح کی باتیں سوچتی ہوئی وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے درگوش کے بارے میں بھی سوچا، کیا وہ اس کو یاد کرتا ہوگا پھر اس نے اپنے اندر سے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی۔
”تم پریشان نہ ہو۔ وہ تم کو چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تم نے سچائی دیکھی ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔ پھر وہ سات پردے کھل جائیں گے اور تم آزاد ہوگی۔“
اسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے وہ نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئی۔

☆......☆......☆

وہ سانپ تھا یا اژدھا۔ جو کہ بڑی ہی تیزی سے ایک درخت سے مچان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس کو دیکھ کر درگوش کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے چلانا چاہا وہ چلا بھی نہ پایا۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی لیکن اس کا پورا جسم جیسے پتھر کی کسی مورتی میں تبدیل ہوگیا ہو۔ یہ اس کی پھنکار تھی جس نے اس کو سیٹی سمجھا تھا۔ اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنا چاہا مگر اس کی آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کے ساتھیوں کے ہنسی مذاق کی آوازیں اس کو بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے جسم کے تمام مساموں نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔

درگوش نے حلق پھاڑ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دینا چاہی لیکن اس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ چلا نہ سکا۔ اس کے جسم میں صرف اس کی آنکھیں تھیں جو حرکت کرسکتی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کردیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس سے دل کو تقویت اور خوف سے نجات ملتی ہے، یہی ہوا اس کا جسم ان دیکھی بندشوں سے آزاد ہوگیا پھر درگوش کو اور کچھ نہ سوجھا، اس نے جیب سے پستول نکالا اور اس اژدھے یا سانپ کی جانب فائر کردیا جو کہ اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر درگوش حیران رہ گیا کہ گولیاں اس سانپ سے ٹکرا کر اچٹ گئیں جیسے کہ اس کا جسم پتھر کا ہو۔ گولیوں کی آواز سن کر تینوں بوکھلا گئے مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ عبرت ناک موت ان کا مقدر تھی۔ سانپ یا اژدھے نے اپنا جسم ان تینوں کے گرد کسی چادر کی طرح لپیٹ دیا۔ پھر ان دلدوز چیخوں سے علاقہ گونج اُٹھا۔ آناً فاناً وہ بے حس و حرکت ہوگئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل درگوش نے صرف اتنا دیکھا کہ اس اژدھے نے غائب ہونے سے پہلے اس کی جانب بڑی ہی تیز نظروں سے دیکھا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد دماغ قدرے اعتدال میں آیا تو فوراً ہی اس کی آنکھوں کے

سامنے مچان والا منظر گھومنے لگا تھا۔ وہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا عین اسی وقت ایک نرم وملائم ہاتھ اس کے سینے پر آ کر رک گیا۔

''شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔''

اس نے چونک کر دیکھا تو ایک نہایت ہی خوبصورت اور جواں سالہ نرس کھڑی تھی جس کے لبوں پر ہمدردانہ مسکراہٹ تھی۔ اب درگوش نے ادھر ادھر دیکھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ کسی ہسپتال کے وارڈ میں ہے۔

''میں یہاں کیسے۔''

''آپ کو بے ہوشی اور شدید بخار کی حالت میں آپ کے محکمے کے لوگ لائے تھے۔ تین دن کے بعد آپ کو ہوش آیا ہے۔'' نرس نے اطلاع دی۔

''تین دن بعد۔'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کے لوگوں میں کوئی موجود ہے کہ نہیں۔'' اتنا کہہ کر نرس کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد درگوش نے پوری قوت صرف کی اور اُٹھ بیٹھا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے اندر بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ اس کی توانائی کہیں کھو گئی ہو۔

جلد ہی نرس کی واپسی ہوئی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایس ایچ او کمال فاروقی بھی تھے۔ اس کے چہرے پر نہایت گمبھیر قسم کی سنجیدگی موجود تھی۔

''ارے آپ اُٹھ کر کیوں بیٹھ گئے۔'' نرس فوراً بول اُٹھی۔

''میں ٹھیک ہوں نرس۔'' درگوش نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ تینوں کہاں؟ کس حال میں ہیں۔'' درگوش نے فوراً ہی کمال فاروقی کو مخاطب کیا۔

اسی وقت ہی فاروقی نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد کمال فاروقی درگوش کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

”اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔“ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

”کیا؟“ درگوش چلا اُٹھا۔ ”وہ تینوں مر گئے۔“

”ہاں۔ زہر کا اثر اتنا شدید تھا کہ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ان کی لاش پھول کر کپا ہو چکی تھی۔ آخر وہاں ہوا کیا تھا؟“

درگوش نے سانپ کا حال کہہ سنایا۔ پوری بات سن لینے کے بعد کمال فاروقی کی آنکھوں میں حیرت ناچنے لگی تھی۔

”یہ کس طرح ممکن ہے کہ سانپ پر گولیوں کا اثر نہیں ہوا۔ فاروقی غیر یقینی انداز میں بولا۔

”اس بات کو میں بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔“ درگوش نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر تو ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔“ فاروقی کا لہجہ ڈرامائی ہو گیا۔ درگوش اس کی جانب وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”وہ کوئی جن تھا۔ ضرور تم لوگوں نے کوئی حرکت کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ ناراض ہو گیا۔“ اس کی بات سن کر درگوش چونک گیا اور پھر کچھ سوچنے لگا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”مجھے یاد آیا کہ اس حادثہ سے کچھ دیر پہلے میں نے ایک پیڑ کے نیچے پیشاب کیا تھا۔“

”اوہ۔ یہی تو۔“ فاروقی اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”کیا تم وہاں بول کر بیٹھے تھے۔“

”سمجھا نہیں۔“

”ایسی ویران جگہوں پر اکثر جنات کا بسیرا ہوا کرتا ہے۔ اور جنات کو اکثر سانپوں کے

روپ میں آنا پسند ہوتا ہے۔اور اگر کوئی بول کر بیٹھے تو وہ جنات اس جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ تم نے بغیر بولے اس کا گھر گندا کر دیا، اس بات کا اس نے بدلہ لیا ہے۔''

''کیا بے وقوفی والی باتیں کر رہے ہو؟'' درگوش نے برہمی سے کہا۔

''یہ باتیں بے وقوفی کی بات نہیں ہے۔تم تو جانتے ہو میں پیری مرشدی کے چکر میں زیادہ رہتا ہوں اور جنات کا ذکر تو قران مجید میں بھی موجود ہے۔''

''میں قران مجید کی کسی بات سے انکار نہیں کر رہا۔میں تو بول کر بیٹھنے والی بات کو ماننے سے انکار کر رہا ہوں۔اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہے تو وہ جن مجھے ٹھکانے لگاتا نہ کہ میرے ساتھیوں کو۔ضرور یہ کوئی اور چکر ہے۔''

''تمہاری بات میں تو وزن ہے۔پھر تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔یا تو سانپ نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی یا پھر تمہاری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔گولی اس کے قریب سے گزر گئی ہوگی۔''

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔'' آصف احمد درگوش نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''صرف آرام۔انکوائری جاری ہے جلد ہی کچھ سامنے آجائے گا۔'' فاروقی مسکرا کر بولا۔

☆......☆......☆

بڑے سرکار اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ان کی آنکھیں بند تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوں۔طوسیہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور عقب میں آ کھڑی ہوگئی پھر کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہی لرزے کہ اس نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا اور خاموش ہی کھڑی رہی۔

''میرے پیچھے کیوں کھڑی ہو۔سامنے آؤ۔'' بڑے سرکار کی آواز سن کر وہ بری طرح سے چونک گئی۔طوسیہ بوکھلا کر سامنے آگئی۔وہ ابھی تک وہ حیران تھی۔

''بابا! میں تو چپکے سے آئی تھی آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''میری آنکھیں بند ہوں یا کھلی لیکن میں کبھی اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں رہتا۔ یوں بھی میرے سینکڑوں دشمن اور ہزاروں دوست ہیں۔ اگر میں غافل ہو جاؤں تو غفلت میں ہی مارا جاؤں۔''

''لیکن میں تو آپ کی کوئی دشمن نہیں ہوں۔''

''میں نے صرف ایک مثال دی تھی۔'' جواب مسکرا کر دیا گیا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' طوسیہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

''کہو۔''

''لیکن پہلے آپ یہ بتائیں آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔''

''یہ تو اسکا فیصلہ تمہاری بات سن کر ہی ہوگا۔''

''اس کا مطلب ناراض ہونے کا امکان ہے۔''

''اچھا بابا، اب میں ناراض نہیں ہوں گا۔ اب بولو۔''

''بابا۔ مم۔ میں۔۔۔'' وہ بولتے ہوئے رک گئی۔ وہ ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ بڑے سرکار کی معنی خیز نگاہیں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ اس کے بولنے کے منتظر تھے۔

''میں انسپکٹر درگوش سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

اس کی بات سن کر بڑے سرکار کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''اوہ۔ وہ دو ٹکے کا پولیس آفیسر۔''

''وہ دو ٹکے کا نہیں ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' طوسیہ کی آواز اونچی ہو گئی۔

''بابا! پیار، محبت۔'' بڑے سرکار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''دو چار ہی دن میں اس دو ٹکے

کے انسان نے تمہارا دل جیت لیا۔اور میں جو سالوں سے تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہوں۔تم ان چار دنوں کے آگے کوئی حساب نہیں رکھو گی۔"

"کیا مطلب۔"

"وہ عام اور معمولی انسان ہے۔لیکن تم عام اور معمولی نہیں۔تمہاری رگوں میں شاہی خون ہے۔تم ایک شاہی قبیلے کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔" بڑے سرکار نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"شاہی قبیلہ۔شاہی خاندان۔میں سمجھی نہیں۔"

"ہاں۔تم کوئی معمولی نہیں۔" بڑے سرکار نے سنجیدگی سے کہا۔"یہاں سے کوسوں دور ایک علاقہ ہے۔تم وہاں کی ملکہ ہو۔تمہاری پیٹھ پر جو نشان ہے وہ اس شاہی خاندان کی میراث ہے۔"

"تو کیا میرے ماں باپ زندہ ہیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"نہیں۔اس قبیلہ میں بغاوت ہوگئی اور ان کو قتل کر دیا گیا۔اور میں تم کو وہاں سے لے کر فرار ہو گیا۔ورنہ اس بغاوت میں تمہاری اور میری موت پکی تھی۔"

"اوہ۔" طوسیہ کے منہ سے نکلا۔

"بس مجھے ایک خاص وقت کا انتظار ہے جس کے بعد میں تم کو وہاں لے جاؤں گا۔"

بڑے سرکار کے لہجے میں عجیب سی سرشاری تھی۔

بڑے سرکار کی بات سن کر وہ خاموش رہی۔وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ آیا ان باتوں پر یقین کرے یا نہیں۔ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ بڑے سرکار کی آواز پھر اس کو سنائی دی۔وہ کہہ رہے تھے۔

"جب وہاں راج کرو گی حکومت کرو گی۔کیا پھر بھی تم درگوش جیسے انسان کو یاد رکھو گی۔"

وہ خاموش ہی رہی۔ اسکے دل میں تو بس صرف درگوش کی ہی تصویر تھی۔ درگوش جس نے دل کے دھڑکنے کا مفہوم سمجھایا تھا۔ درگوش جس نے اسکو احساس دلایا تھا کہ وہ بھی چاہے جانے کے قابل ہے۔

''خاموش کیوں ہو۔ جواب دو۔'' بڑے سرکار نے اس کو چپ دیکھ کر کہا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

عین اسی وقت کہیں دور سے گھنٹی کی آواز ابھری جسے سن کر بڑے سرکار چونک گئے۔ پھر جلدی سے طوسیہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''اب جاؤ جا کر سو جاؤ کل بات کریں۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے طوسیہ کے جانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور بڑی ہی تیزی سے گھنٹی کی آواز کی سمت بڑھ گئے۔ جو کہ دوبارا ابھری تھی۔ ان کے قدم بڑے تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد طوسیہ چند لمحے وہاں کھڑی رہی اور پھر باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

درگوش کا پورا دن اسی ہسپتال کے اسی کمرے میں گزرا تھا۔ دن بھر وہ خوبصورت اور نازک سی نرس اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ اس نرس کو دیکھ کر درگوش کو ہمیشہ جاپانی گڑیا یاد آجاتی۔ وہ تھی بھی اس قدر نازک۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ نرس سے بہت سی باتیں کرتا مگر اس کے دماغ کے کارخانے میں اپنے ساتھیوں کی موت ہی مینوفیکچر ہو رہی تھی۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ کل تک ہنسنے بولنے والے یوں موت کے ہمکنار ہو جائیں گے۔ زندگی کا یہی دستور ہے جو آیا ہے وہ جائے گا۔ باقی ذات تو صرف اللہ کی ہے جو رحمان و رحیم ہے۔ پھر اس کو جبران یاد آیا تھا جو فرض پر قربان ہو گیا۔ اپنے تین ساتھیوں کی موت سے اسکو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی زندگی

کتنی ویسٹ کی۔ پولیس سروس میں وہ صرف وہ کانچے کے چکر میں پڑا رہا تھا اس کو خود سے گھن سی آنے لگی تھی۔

''کیا میں آپ کے کپڑے بدل دوں۔'' نرس کی آواز نے اس کو خیالات سے چونکا دیا تھا۔

''آں۔'' اس نے نرس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''شکریہ میں خود ہی کرلوں گا۔ اب کافی بہتر محسوس کررہا ہوں۔''

''دراصل میری ڈیوٹی اب ختم ہونے والی ہے اور میں جارہی ہوں۔'' نرس نے بتایا۔

''آپ بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ جب دوبارا ڈیوٹی پر آؤ گی تو میں نہیں ملوں گا۔ میں گھر چلا جاؤں گا۔''

''نہیں۔ آپ کو کمپلیٹ بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے۔''

''شکریہ نرس، میں اتنا آرام نہیں کرنا چاہتا مجھے اور بھی کام ہے۔ میں تمہاری خدمات کو یاد رکھوں گا۔ کیا نام ہے تمہارا۔''

''مم۔ میرا نام لبنیٰ ہے۔''

''شادی ہوگئی آپ کی۔''

''شادی۔'' اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''کیوں۔'' اس کی تلخی محسوس کر کے اس نے حیرت سے پوچھا۔

''شادی کے بازار میں ہم لڑکیاں شوپیس ہی تو ہیں۔ ہر بار تیار ہو کر دکھائی جاتی ہیں اور پھر مسترد کردی جاتی ہیں۔'' جواب میں تلخی نمایاں تھی۔

درگوش نے کوئی جواب نہ دیا۔ واقعی یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے جو کہ ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ لڑکیاں تیار ہو کر پسند کرنے کے لئے دکھائی جاتی ہیں پھر دولہا یا

دولہے کی ماں کی کسی نہ کسی وجہ سے مسترد کردی جاتی ہیں۔درگوش افسردہ ہوگیا۔نرس چلی گئی اور وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا تھا۔

ڈاکٹروں کی ہدایات کی پرواہ کیئے بغیر وہ ہسپتال سے نکل گیا۔سب سے پہلے وہ پرسہ دینے کے لئے اکرام کے گھر جا پہنچا تھا۔چھوٹا سا گھر گویا ایک قبرستان میں بدل چکا تھا۔ اکرام کے بوڑھے ماں باپ اور دو چھوٹے بچے ان کی زندگی جیسے رک گئی۔اکرام تو چلا گیا لیکن اپنے ساتھ پانچ لوگوں کو اور بھی مار گیا تھا۔ان کے آنسو تو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔درگوش کو ان کی آنکھوں میں صرف ایک ہی سوال نظر آیا تھا کہ ہمارا کیا قصور ہے، ہم کس کے سہارے جئیں گے؟

درگوش کو اس منحوس سانپ پر غصہ آنے لگا تھا۔وہ دل گرفتہ ہو کر وہاں سے نکل آیا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس سانپ کی بوٹیاں نوچ لے۔

گھر پہنچ کر بھی اس کا جی اچاٹ رہا۔اکبر نے اس کی خیر خیریت دریافت کی اور کھانے کا پوچھا لیکن اس کا دل نہ تھا۔بس چائے کا بول کر وہ اپنے کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔اچانک اس نے کسی خیال کے پیش نظر الماری کھولی، سانپ کی مورتی اسی جگہ موجود تھی۔اس کی آنکھوں کی چمک سے گویا روشنی کے ہالے پھوٹ رہے تھے۔نہ جانے کیوں درگوش کو ایسا لگا کہ یہ وہی سانپ ہے جس نے اس کے ساتھیوں کی جان لی تھی۔لیکن یہ بے جان ہے بھلا یہ کسی کی جان کیسے لے سکتا ہے۔پھر اس نے الماری کا پٹ بند کردیا۔

☆......☆......☆

پوری رات انسپکٹر آصف احمد درگوش عجیب وغریب خواب دیکھتا رہا تھا۔کبھی وہ اپنے آپ کو سانپوں میں گھرا ہوا پاتا تو کبھی ویران جنگل میں اس کو اپنے مردہ ساتھی دکھائی دیے تھے۔

اچانک وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب یوں اس کی نیند اچاٹ ہوئی تھی۔جلد ہی اس کو وجہ سمجھ میں آگئی۔اس کو اُٹھانے والے چار لوگ تھے ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں ملبوس تھے۔اپنے چہروں کو چھپانے کے لئے نقاب کا استعمال کیا تھا۔صرف آنکھوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

''کون ہو تم لوگ۔'' درگوش نے بے خوف ہو کر پوچھا۔

''موت کے فرشتے۔'' جواب ملا۔

''موت کے فرشتے۔تو یہاں کیوں آئے ہو؟'' درگوش نے پوچھا۔

''ایک تو یہ سوال بہت کرتا ہے دادا۔'' ایک نقاب پوش نے اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھ کر کہا۔

''کیوں، کیا ہم کلاس روم میں پرچہ دینے آئے ہیں؟'' انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''نہیں دادا۔'' ایک نے جواب دیا۔

''سن لیا۔'' وہ نقاب پوش درگوش کی طرف گھوما اور بولا۔''خیر تمہارا دل رکھنے کے لئے جواب دیتا ہوں۔وہ سانپ کی مورتی کہاں ہے؟''

درگوش اس وقت واقعی بے بس تھا۔چاروں ریوالوروں کے رخ اسی کی طرف تھے۔کسی بھی قسم کی مہم جوئی کا مطلب موت کے سوا کچھ اور نہیں تھا لیکن یہ لوگ اندر کس طرح آئے۔انہوں نے اکبر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ کئی طرح کے سوالات اس کے دل میں دماغ میں اُٹھ رہے تھے۔پھر نقاب پوش کے الفاظوں پر وہ بری طرح سے چونک گیا۔

''تم سوچ رہے ہو گے ہم نے تمہارے نوکر کے ساتھ کیا کیا۔''

درگوش نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تمہارا نوکر تم سے زیادہ ہوشیار نکلا۔چپ چاپ بندھوا لیا اپنے آپ کو۔بیچارا کچن

میں پڑا ہے بندھا ہوا۔‘‘ وہ ہنس کر بولا۔

’’میں نہیں جانتا تم کون سی مورتی کی بات کر رہے ہو۔‘‘ درگوش نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’وہی مورتی جو اس باکس میں تھی جس کو تم نے ساحل پر ریڈ کر کے پکڑا تھا۔ تمہارے ساتھ تین ساتھی تھے۔ وہ تو مر گئے اور ہم ان کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد ہی تمہارے پاس آئے ہیں۔‘‘

’’اطمینان۔ مطلب؟‘‘ درگوش چونک گیا۔

’’ان کے گھروں کی باقاعدہ تلاشی کے بعد اب تمہاری باری ہے۔ تم کہہ رہے ہو تم نہیں جانتے۔ کوئی بات نہیں ہم خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔‘‘

’’تم یہ بڑی بھول کرو گے۔‘‘ تلاشی کے نام پر درگوش نے گھبرا کر کہا۔

’’شٹ اپ۔‘‘ آواز بڑی ہی گونجیلی تھی۔

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولا۔

’’میں اس پولیس والے کو سنبھالتا ہوں تم لوگ اس مورتی کو تلاش کرو۔‘‘

اتنا سننا تھا کہ وہ تینوں کمرے کی تلاشی میں مصروف ہو گئے۔

’’یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ قانون سے کھیل کر تم لوگ جرم کر رہے ہو۔‘‘ درگوش نے غراتے ہوئے کہا۔

’’قانون۔ ہاہاہا۔‘‘ درگوش کی بات سن کر وہ ہنس پڑا۔

’’کس قانون کی بات کرتے ہو تم۔ وہی قانون جو عام کے لئے کچھ اور خاص کے لئے کچھ اور ہے۔ یا وہ قانون جو سگنل توڑنے پر پانچ سو روپے لے کر چھوڑ دیتا ہے۔‘‘ نقاب پوش نے ہنس کر کہا۔ اس کی بات سن کر درگوش خاموش ہو گیا۔ بات تو ٹھیک تھی۔ قانون میں بہت

سے سقم تھے لیکن پھر بھی قانون کے ہونے سے بہت سے جرائم رکے ہوئے تھے۔

''اگر تم گرفتار ہوئے تو بہت برا سلوک ہوگا تمہارے ساتھ۔''

''مان لیا۔ جب گرفتار ہونگے تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' نقاب پوش نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت اس کے ساتھی مڑے اور اس میں سے ایک نے کہا۔

''دادا! یہاں تو کچھ بھی نہیں۔''

''ابے الو کے پٹھو۔ الماری کون دیکھے گا۔'' نقاب پوش غرایا۔

''اوہ۔ ہاں۔ استاد۔''

اتنا کہہ کر وہ الماری کی جانب بڑھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ایک کی آواز سنائی دی۔

''دادا! یہ تو لاک ہے۔''

''اوہ۔ مورتی اس میں ہے چابی دو۔'' نقاب پوش درگوش کی طرف مڑ کر غرایا۔

''چابی میری جیب میں ہے۔'' درگوش نے اطمینان سے کہا۔

''رک جاؤ۔ ہم چابی خود نکال لیں گے۔ جیک، تم چابی جیب سے نکال لو۔''

جیک نے اس کی خونخوار نظروں کی پرواہ کئے بغیر جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور چابی نکال لی۔

''تم لوگ اپنے لئے گڑھا کھود رہے ہو۔'' درگوش بول اُٹھا۔

''تم کو اس گڑھے سے کیا تکلیف ہے۔'' ناگر کا لہجہ پر مزاح تھا۔ درگوش اس پر کھول کر رہ گیا۔ جلد ہی الماری کھول لی گئی۔ درگوش نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس مورتی کو ان کے قبضے میں جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''مورتی الماری میں نہیں ہے۔'' نقاب پوش کی آواز سن کر درگوش نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اس وقت عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ مورتی کی گمشدگی پر کسی قسم کے

ردعمل کا اظہار نہیں کیا وگرنہ اس کو اس بات پر حیرت تھی کہ مورتی گئی کہاں۔

''میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میں کسی مورتی کے بارے میں نہیں جانتا۔ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی تم لوگوں کو۔'' درگوش نے قدرے نرمی سے کہا۔

''ہونہہ۔تو تم نہیں بتاؤ گے؟'' ناگر نے کڑے لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔چاہو تو پورے گھر کی تلاشی لے لو۔''

''اب تو یہی کرنا ہوگا۔'' ناگر غرایا۔

''رسی لا کر اس کو باندھ دو۔'' ناگر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں درگوش کو رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔پورے گھر کی تلاشی لینے کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔نقاب پوشوں نے باہر آ کر درگوش کے فلیٹ کا دروازہ باہر سے لاک کیا اور پارکنگ کی طرف نکل آئے۔

''دادا!مورتی اس کے پاس نہیں تو پھر کہاں ہے۔'' ٹونی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مورتی اسی کے پاس ہے،سالا ناٹک کر رہا ہے۔خیر میرا نام بھی ناگر ہے۔اب تم لوگ اس پر نظر رکھو گے۔'' اتنا کہہ کر ناگر چلتے چلتے رک گیا۔اس دیکھا کہ جیک پارکنگ کے اندھیرے والی جگہ پر جا رہا ہے۔

''ابے۔کہاں جا رہا ہے۔ناگر نے چلا کر پوچھا

''دادا۔موتنے۔'' جیک نے انگلی اُٹھا کر اشارہ کیا۔

اس کی بات سن کر سارے ساتھی ہنس پڑے تھے۔

''کتے والی عادت تمھاری کبھی نہیں جائے گی۔باتھ روم اس طرف ہے۔'' ناگر نے غصہ سے کہا۔

جواباً جیک کھی کرتا ہوا باتھ روم کی سمت بڑھ گیا۔ وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے تھے۔

"دادا! بھوک لگی ہے۔" پنٹو نے کہا۔

"یار، لگ تو مجھے بھی رہی ہے۔ مگر اس وقت کون سے ہوٹل کھلے ہوں گے۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"تم لوگ بھی ہر وقت ہی کھانے پینے کے بارے میں ہی سوچنا۔ کام کی کسی کو فکر ہی نہیں۔" ناگر نے قدرے غصے سے کہا۔ ابھی ٹونی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک عجیب سی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ آواز گاڑی کی پچھلی سیٹ سے آ رہی تھی۔

"یہ کیسی آواز ہے۔"

اتنا کہہ کر ٹونی نے عقبی سیٹ کی طرف مڑ کر دیکھا تو دوسرے ہی پل اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی تقلید میں اس کے ساتھیوں نے بھی مڑ کر دیکھا تو ان کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ جیکی جیسے ہی باتھ روم سے فارغ ہو کر گاڑی کے پاس پہنچا اندر کا منظر دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ خوف کا شدید ترین احساس اسکے چہرے پر نظر آنے لگا تھا۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح جدھر سینگ سمائے بھاگ والی مثال کے مصداق الٹے قدموں بھاگتا ہی چلا گیا۔

درگوش نے جان بوجھ کر اپنے جسم کو قدرے پھلا لیا تھا کہ جب اس کے گرد رسیاں لپیٹی جا رہی تھیں اس کے باوجود باندھنے والے کافی تیز طرار تھے۔ یہی وجہ تھی آزاد ہونے کے لئے اس کو کافی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے خود کو آزاد کروا لیا تھا۔ اس کو اکبر کے بارے میں بھی کافی تشویش تھی کہ ان ظالموں نے نہ جانے اس کیساتھ کیا کیا ہوگا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ مورتی گئی کہاں؟ نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ مورتی پر اسرار

خصوصیت کی حامل ہے۔ اس نے سونے سے پہلے مورتی کو خود ہی الماری میں لا کر رکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہی ہو چکا تھا یہ دوسری بار تھا۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس طرح مورتی کے غائب ہونے میں کیا راز پوشیدہ تھا، یہ پراسرار سانپ کی مورتی کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی؟ کئی قسم کے سوالات تھے جس نے درگوش کے ذہن کو الجھا دیا تھا لیکن فی الحال اس کو اکبر کی خبر گیری کرنی تھی۔ اس بے چارے کو اس طرح باندھ کر ڈالا گیا تھا کہ منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

''یہ کون لوگ تھے درگوش بابو۔ پورا گھر برباد کر دیا ان حرام خوروں نے اور کچھ کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔'' اکبر نے تشویش سے کہا۔

''تو کیا کر لیتے تم، سنی دیول بن کر ان چاروں کا قیمہ کر دیتے۔'' درگوش نے ہنس کر کہا۔

''نہیں بابو۔ کم از کم آپ کو خبردار کر دیتا۔''

''خیر جو ہوا سو ہوا۔ تم گھر کو سیٹ کرو۔ اجالا ہونے ہی والا ہے میں باہر سے ہو کر آتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر درگوش فلیٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف آ گیا۔ اسی لمحے چوکیدار بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی تھی۔

''بب۔ بب۔'' شدید بدحواسی کے سبب الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' درگوش نے تیز لہجے میں پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے پارکنگ کی طرف اشارہ کر دیا۔

''ہوا کیا ہے؟''

''بب۔ بات ہی کچھ ایسی ہے جناب۔ وہ سامنے والی لال گاڑی میں تین آدمی بے ہوش پڑے ہیں۔''

”کیا۔ تین آدمی۔“ وہ چونکا۔

”جناب! میں ایک راؤنڈ لگا کر واپس آیا تو یہ گاڑی کھڑی دیکھی۔ اس سے پہلے نہیں تھی یوں بھی میں سب گاڑیاں پہچانتا ہوں۔ پھر اسی کار کے اندر روشنی ہو رہی تھی میں نے قریب جا کر دیکھا تو عجیب و غریب حلیوں میں تین آدمی بے حس و حرکت دکھائی دیے۔“

”عجیب و غریب حلیے، مطلب۔“

”ان کے چہروں پر سیاہ نقاب لگے ہوئے تھے۔“

”ارے۔“ درگوش نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی تھی۔ پھر گاڑی کے اندر والی روشنی میں اس نے تینوں کو دیکھا تھا مگر اس میں چوتھا نہیں تھا لیکن چوکیدار کا اندازہ غلط تھا۔ وہ بے ہوش نہیں تھے مر چکے تھے۔ ان کے جسم نیلے پڑ چکے تھے۔ ان کے پیشانیوں پر سانپ کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کے جسموں کی رنگت ہو بہو وہی تھی جو اس کے ساتھیوں کی تھی۔ چوتھا آدمی غالباً فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

بہت جلد ہی پولیس کی بھاری نفری درگوش کی اطلاع پر وہاں پہنچ گئی۔ جب شور شرابا ہوا فلیٹوں کے دوسرے مکین بھی جاگ اُٹھے تھے۔ جب ان کو صورتحال کا علم ہوا تو ایک خوف کا ماحول پیدا ہو گیا۔ درگوش نے کسی قسم کا کوئی بیان نہیں دیا۔ یہ خبر ذرا ہی دیر میں جنگل کی آگ بن کر پھیل گئی تھی ہر طرف اس پراسرار سانپ کی داستانیں پھیل گئیں تھیں۔ ان تینوں کے متعلق یہ اخذ کر لیا گیا تھا کہ یہ لوگ ان فلیٹوں اور اس کے اطراف میں کوئی واردات کرنے آئے تھے مگر سانپ نے ان کو موقع ہی نہیں دیا۔ یہ تینوں پولیس کو مختلف وارداتوں میں مطلوب تھے۔ بہر حال اس سانپ کے متعلق اب غور کیا جا رہا تھا کیونکہ اب کسی کی بھی جان محفوظ نہیں تھی۔

درگوش اپنے فلیٹ میں واپس آیا تو اجالا ہو چکا تھا۔ صبح کے چھ یا ساڑھے چھ کا عمل تھا۔ اکبر فلیٹ کو سیٹ کر چکا تھا۔ اب چائے بنا رہا تھا۔ اس کو چائے اور ناشتہ لانے کا بول کر جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا بری طرح سے اچھل پڑا۔ سانپ کی مورتی اس کے بیڈ پر موجود تھی اور اس کی ہیروں والی آنکھیں گویا انسپکٹر درگوش کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ درگوش اسے عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر سرسراتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

''وہ خونی سانپ تم ہی ہو۔ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ تم ہو۔''

سانپ کسی پتھر کی طرح بے جان اسی جگہ پڑا رہا۔ درگوش آہستہ سے اسکی طرف بڑھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا کہ مورتی ایک سانپ میں تبدیل ہو گی اور اس پر حملہ کر دے گی۔

وہ بیڈ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں الجھا اور وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ یہ ضرب کافی شدید تھی۔ چند لمحوں کے لئے جیسے اندھیرا سا چھا گیا۔

''ارے درگوش بابو۔'' اکبر تیزی سے اسکی جانب بڑھا تھا۔ اس نے ٹرے فوراً ایک طرف رکھی اور درگوش کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ بدقت ہی وہ اُٹھ پایا تھا۔ سر کسی پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا بابو، چکر آ گیا۔ آپ ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں کمزوری بہت ہے آپ لیٹ جائیں۔''

''نہیں یار، تم جاؤ۔''

درگوش نے گھوم کر فرش پر دیکھا تو وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اسکا پاؤں الجھا ہو۔ اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ جیسے کسی نے اس کو دھکا دیا ہو۔ یکدم ہی اس کو سانپ کی مورتی

کا خیال آیا اور وہ فوراً ہی بیڈ کی طرف گھوما اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مورتی ایک بار پھر غائب تھی۔

اور پھر اچانک ہی درگوش کی ایس پی صاحب کے آفس میں طلبی ہوئی تھی۔ اس پیشی پر وہ قدرے حیران تھا۔ ایس پی صاحب نے اس کو نرم گرم انداز میں دیکھا اور اس کو بیٹھنے کے لئے کہے بغیر مخاطب ہوا۔

''مسٹر آصف احمد۔ کتنے سال ہو گئے پولیس سروس میں۔''

''سر پانچ سال ہو گئے۔''

''پھر بھی آپ کو ڈیوٹی کرنا نہیں آیا۔''

''کیا۔ مطلب۔'' وہ چونک گیا۔

''مسٹر آصف۔ تمہارے متعلق کچھ اطلاعات ہیں۔''

''کیسی اطلاعات سر۔'' درگوش کا دل دھڑک اُٹھا۔

''تم نے جرائم پیشہ افراد کی پشت پناہی کی۔ تم پر الزام ہے اسمگل ہونے والے باکس میں سے تم نے کچھ نکال کر غائب کیا ہے۔'' ایس پی خالص آفیسرانہ لہجے میں بولا۔ یہ سن کر درگوش سناٹے میں آ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سانپ کی مورتی کا راز فاش ہو سکتا ہے۔

''بولو۔ جواب دو۔ خاموش کیوں ہو؟''

''سر، میں مانتا ہوں۔ میں نے لالچ میں آ کر اس باکس سے ایک سونے کا سانپ اُڑا لیا تھا۔ لیکن اب سانپ کی مورتی میرے پاس سے غائب ہو چکی ہے۔''

''کیا مطلب۔'' ایس پی نے اس کو غور سے دیکھا۔

''اس بات کا مطلب میں آپ کو آسانی سے سمجھا نہیں سکوں گا۔'' درگوش نے اپنی ٹھوڑی

کھجائی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اب تک چھ افراد اکرام، شیر علی، شکیل اور وہ تین مجرم ایک زہریلے سانپ کی وجہ سے مارے جاچکے ہیں۔“

”ہاں تو۔“ ایس پی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے ہو کہ ساحل پر مرنے والے پولیس اہلکاروں کی موت اور ان مجرموں کی موت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔“

”جی سر، مجھے ایسا لگتا ہے۔ مورتی اور زہریلا سانپ سکے کی ایک ہی تصویر ہے۔“ درگوش طویل سانس لے کر بولا۔

”بہت خوب۔“ ایس پی مسکرایا۔ ”موضوع سے ہٹنا کوئی تم سے سیکھ لے۔ جرم چھپانے کی اچھی توجیہہ ہے تمہاری مگر اس بے سروپا ملاپ کا کوئی جواز نہیں۔“

”بالکل ہے سر۔ اور میں اپنی بات ثابت کروں گا۔“

”میں کوئی بھی بے سروپا کہانی سننے کے موڈ میں نہیں۔ ضبط شدہ مال کی چوری کے الزام میں جب تک محکمانہ کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی تم معطل کیے جاتے ہو۔“ ایس پی کا لہجہ سرد تھا۔

”بہتر یہی ہے کہ وہ مورتی خود قانون کے حوالے کر دو۔ بصورت دیگر اگر جرم تم پر ثابت ہوا تو قانون کے مطابق تم پر کارروائی کی جائے گی۔“ ایس پی نے پھر کہا تھا۔

”سر، سچ جو بھی تھا میں نے بتا دیا۔“

ایس پی نے کوئی جواب نہ دیا پھر اس کی پیٹی بھی اتار لی گئی تھی اور اسلحہ بھی لے لیا گیا تھا۔

اب وہ صرف درگوش تھا۔ صرف درگوش۔

گھر پہنچا تو ایک نئی مصیبت اس کی منتظر تھی۔ اس کے فلیٹ کو باہر سے پولیس اہلکاروں نے گھیرا ہوا تھا۔ انسپکٹر حماد نے اس کو آتے ہوئے دیکھا اور دور سے ہی آواز لگائی۔

’’کہاں ہو، میں تمہاری واپسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ کم از کم میں اتنا تو خیال تو رکھوں گا کہ تمہارے گھر کی تلاشی تمہاری موجودگی میں ہو۔‘‘

’’تلاشی۔‘‘ درگوش نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

’’ہاں۔‘‘ حماد کی آواز میں درد تھا۔ ’’میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا پڑے گا۔‘‘

’’اوہ۔ تو تم کو مورتی کے لئے بھیجا گیا ہے۔‘‘

’’ہاں دوست۔‘‘

’’شوق سے تلاشی لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ اتنا کہہ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ اکبر نے کھولا تھا۔ درگوش کو دیکھ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

’’بابو۔ یہ آپ کا کافی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

’’ہاں یہ ان لوگوں کی مہربانی ہے۔‘‘ درگوش یہ کہتے ہوئے مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد پولیس والے بھی اندر داخل ہو گئے۔ درگوش ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔

’’ابتدائے عشق ہے ہوتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا۔‘‘ درگوش گنگنایا۔

’’لیکن مسٹر درگوش۔‘‘ حماد ڈرامائی انداز میں بولا۔ ’’اب جو ہونے والا ہے وہ بھی اچھا نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب۔‘‘ درگوش اس کی طرف گھوم گیا۔

’’یہ تمہارے بیڈ کے نیچے تھی۔‘‘ اتنا کہہ کر حماد نے اپنے چھپے ہوئے ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سانپ کی مورتی تھی۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ درگوش کے ساتھ ساتھ اکبر بھی آنکھیں پھاڑے اس مورتی کو دیکھ رہا تھا۔

"اب بولو۔کیا کہتے ہو۔"

"کچھ نہیں۔تم جو بھی سمجھنا چاہو، سمجھ لو جو بھی کرنا چاہو کرو میری طرف سے اجازت ہے۔"

"تمہارا جرم ثابت ہو چکا ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تم کو گرفتار کرسکوں۔ میں یہ مورتی ایس پی صاحب کو دے دوں گا اور کہہ دوں گا کہ تم گھر پر نہیں تھے۔"

"نہیں اپنا فرض نبھاؤ تم۔"

"نہیں میں یہ نہیں کرسکوں گا۔" حماد کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ان کے جانے کے بعد اکبر کے منہ سے نکلا۔

"بابو۔یہ سب کیا ہے۔"

"کچھ نہیں یار، تم جاؤ اور چائے بنا کر لے آؤ۔"

"پہلے کھانا کھالیں، میں نے گوبھی گوشت بنایا ہے۔"

"موڈ نہیں ہو رہا۔"

"کل سے آپ نے کچھ نہیں کھایا ہے۔" اکبر کے لہجے میں تشویش تھی۔"اس طرح تو آپ بیمار پڑ جائیں گے۔میں کھانا لا رہا ہوں پہلے کھانا اور پھر چائے۔"

درگوش خاموش ہی رہا۔اکبر بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔وہ واقعی ہی بھوکا تھا پے در پے ہونے والے واقعات نے اس کو موقع ہی نہیں دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اکبر کھانا لے آیا تھا۔کھانے کی سوندھی مہک سے درگوش کو واقعی ہی بھوک لگنے لگ گئی۔ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ کھانے پر بیٹھ گیا۔کھانے کے چند ہی لقمے لئے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔

"دیکھو۔کون ہے۔" درگوش نے اکبر کو اشارہ کیا۔

اکبر اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ''کون ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ایک ہمدرد۔'' باہر سے آواز آئی۔ درگوش کا ہاتھ جہاں تھا رک گیا۔ چہرے پر تفکر کی لکیریں نظر آنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

انسپکٹر حماد نے مورتی ایس پی کے سامنے رکھ دی تھی اور سعادت مندی سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''تو یہ ہے وہ شاہکار جس کو دیکھ کر لوگوں کی نیتوں میں کھوٹ آ رہا ہے۔''

حماد نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموش ہی کھڑا رہا تھا۔

''بہت ہی پرانی اور قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ میں آج ہی ماہرین کو بلاتا ہوں تاکہ وہ اس پر ریسرچ کر سکیں۔''

''جی سر۔''

''کیا تم نے اس کو درگوش کے گھر سے برآمد کیا ہے۔''

''جی ہاں۔'' حماد نے سر ہلایا

''تو تم نے اس کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔''

حماد کو اسی جواب کی توقع تھی اس لئے وہ فوراً ہی بولا۔

''سر، وہ گھر پر نہیں تھا اس کے ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔''

''ہونہہ۔'' ایس پی نے کچھ سوچ کر ہنکارا ابھرا۔ ''بچ کر جائے گا کہاں، آج نہیں تو کل وہ ضرور ہتھے چڑھ ہی جائے گا۔ اس نے ایک جرم کیا ہے جس کی سزا اس کو ضرور ملے گی۔''

''بالکل سر۔''

''اب تم جا سکتے ہو مسٹر حماد۔'' ایس پی نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ حماد نے سیلوٹ مارا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایس پی نے اپنے پی اے کو انٹر کام کر دیا۔

''فوری طور پر کسی ارکیالوجسٹ کو بلاؤ۔ میرے خیال سے پروفیسر درانی ہی بہتر ہوں گے۔''

''بہت بہتر جناب۔'' پی اے نے جواب دیا۔

انٹر کام رکھنے کے بعد ایس پی بڑے ہی غور سے اس مورتی کو دیکھنے لگا۔ یکدم اس کو ایسا لگا کہ جیسے اس کی چمکتی ہوئی ہیرے جیسی آنکھوں میں زندگی کی چمک دوڑ گئی ہو۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اس نے گھبرا کر وہ مورتی فوراً ہی میز پر رکھ دی اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

نادر محل میں اس وقت چھ افراد موجود تھے۔ ان چھ میں جیک بھی موجود تھا جس نے دو دن قبل اپنے تینوں ساتھیوں کو لاشوں کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہ باس کی دعوت پر نادر محل میں موجود تھا۔ نادر محل میں اس کو اپنے علاوہ تین اور اجنبی صورتیں دکھائی دی تھیں جو اسی طرح جرائم پیشہ ہی تھیں۔ نادر محل میں ان لوگوں کو شاید اسی وجہ سے بلایا گیا تھا۔ حسبِ معمول کھانے پینے کا انتظام موجود تھا۔

کھانا دیکھ کر جیک کو اپنے ساتھیوں کی یاد ستانے لگی۔ خاص کر ناگر کی۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے کام آتا تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کی موت سے اس کا دل بجھا سا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں باس کی آواز ابھری جو کہ قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں جانتا ہوں جیکی کہ آج تم میری طرح اداس ہو۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز ہال میں گونجی۔

’’ہاں باس، میں ان کی لاشوں کو بھول نہیں سکتا۔ اگر میں حاجت کے لئے نہ جاتا تو میں لاش بن جاتا۔‘‘ جیک نے گلوگیر آواز میں کہا۔

’’ان لوگوں کی واپسی ناممکن ہے چنانچہ میں جیک کو تم لوگوں کا ہیڈ بنا رہا ہوں۔ اور مجھے امید ہے تم لوگ جیک کو شکایت کا موقع نہیں دو گے۔‘‘ باس کی سپاٹ آواز سنائی دی۔

’’ہم تیار ہیں باس۔‘‘ تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

’’شاباش۔ یاد رکھنا غداری کی سزا صرف موت اور وفاداری کا انعام بہت زیادہ دولت ہے۔‘‘ باس کی سرد آواز ابھری۔

’’میں اس قابل نہیں باس کہ ناگر دادا کا عشر عشیر بھی بن سکوں مگر میں کوشش کروں گا۔‘‘ جیک نے بھرائی آواز میں کہا۔

’’شاباش۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب غور سے سنو، اپنی وارداتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھو جو کہ ہمارے معمول کے مطابق ہوتی ہیں لیکن مرکزی منصوبہ اسی مورتی کے گرد گھومے گا۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ یہ معلوم کرو کہ مورتی کہاں ہے؟ اس کے لئے درگوش پر چیل کی نگاہ بن کر منڈلاتے رہو۔ اور مجھے امید ہے کہ اس سے مورتی کا راز ضرور ملے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے باس، ناگر دادا کی بھی یہی خواہش تھی کہ ہم لوگ درگوش پر نظر رکھیں گے اور مجھے امید ہے کہ وہ ضرور ہمارے قبضے میں آجائے گی۔‘‘

’’بہت خوب مجھے تم سے یہی توقع تھی۔‘‘ باس کی قدرے بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔

’’ایسا ہی ہوگا۔ یہ کام اب میں ناگر دادا کی روح کے لئے سکون کے لئے کروں گا۔‘‘ جیکی نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

پروفیسر درانی کا تعلق ملک کے بہترین ارکیالوجسٹ میں تھا۔ ان کے بہت سے تحقیقی مقالے اخبارات کی زینت بنتے ہی رہتے تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں اب بھی مغربی ممالک میں پڑھائی جاتی تھیں۔ بہت سی مردہ تہذیبوں کی دریافت ان ہی کی بدولت تھی۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی ان کو اس کام سے بے حد لگاؤ تھا چنانچہ یہ مورتی جب ان کے پاس لائی گئی تو وہ چونک پڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بچوں کی سی چمک دوڑ گئی۔

''درانی! تم میرے بہترین دوست ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ریسرچ کرو کہ یہ مورتی کتنی پرانی ہے۔ اور تمہارے خیال میں کہاں سے لائی گئی ہوگی۔'' ڈی ایس پی نے ان کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویلڈن بہت خوبصورت۔'' پروفیسر درانی نے اس پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ان کی کیفیت بالکل اس بچے کی طرح تھی جس کو اس کا من پسند کھلونا مل گیا ہو۔

''پروفیسر، اس مورتی سے بہت سے خون وابستہ ہیں اس لئے تم کو بلایا گیا ہے۔''

پروفیسر درانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اس مورتی کی جانب ہی سحر زدگی کے عالم میں تکے ہی جا رہے تھے۔

''تم جواب کیوں نہیں دیتے پروفیسر۔''

''مجھے ایک دن دو ڈی ایس پی۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہ مورتی فراعنہ مصر کے کسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔'' پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

''تم ایسا کرو درانی، تم میرے آفس کے ساتھ والا کمرا لے لو۔ اس میں اپنی ریسرچ کرو یہ مورتی کہیں باہر جا نہیں سکتی۔'' ڈی ایس پی نے مسکرا کر کہا۔

''مگر یہ ریسرچ میری لیب میں زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔'' درانی نے مسکرا کر کہا۔

”ہرگز نہیں۔ یہ ہائی پروفائل انکوائری ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ پروفیسر درانی نے شانے اچکائے۔

اس کے بعد پروفیسر درانی نے اپنے آپ کو ڈی ایس پی کے آفس کے ساتھ والے کمرے میں ہی بند کر دیا تھا۔ اپنے ساتھ ریسرچ کے تمام ضروری چیزیں لے لی تھیں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ اچانک کمرے میں سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ آواز میں نہایت ہی درد و کرب کے تاثرات موجود تھے۔

چیخ سنتے ہی ڈی ایس پی چونک پڑا۔ ڈی ایس پی نے اپنے دو تین حوالدروں کی مدد سے دروازہ توڑ دیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر سب ہی کے چہروں پر دہشت نظر آنے لگی تھی۔ پروفیسر درانی کے کمرے کا منظر نہایت ہی دہشت ناک تھا جس کو دیکھ کر ڈی ایس پی سمیت سب لوگوں کا چہرا خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ پروفیسر درانی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا سر میز پر ڈھلکا ہوا تھا اور ان کا اسسٹنٹ فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ ڈی ایس پی نے بھاگ کر پروفیسر کو سیدھا کیا تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

”اف خدایا۔“

پروفیسر اس دنیا میں نہیں تھے۔ ان کا چہرا نیلا پڑ کر سوج چکا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی موت میں کسی سریع الاثر زہر کا ہاتھ ہے۔ ان کے ماتھے پر سانپ کے دانتوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے اسسٹنٹ کا بھی یہی حال تھا۔

”یہ سب کیا ہے۔“ ڈی ایس پی کا سیکرٹری جواُن کے ساتھ تھا لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”معلوم نہیں۔ میری خود عقل خبط ہے اور مورتی بھی غائب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درگوش ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ اچانک وہ بولتے بولتے رک گیا پھر کسی خیال کے تحت وہ ان کی نوٹ

بک کی طرف جھپٹا۔ وہاں صرف دو لفظ لکھے تھے جو کہ کچھ عجیب سے تھے۔

''گاماساں اناتھا۔''

اس سے آگے شاید موت نے ان کو مہلت نہیں دی تھی۔

''کاش وہ تحریر مکمل کر لیتے۔'' ڈی ایس پی بڑبڑایا۔ ''وہ اس مورتی کے بارے میں ضرور کچھ جان گئے تھے۔ ہمارے ملک کا ایک عظیم سرمایہ ہم سے چھن گیا۔'' ڈی ایس پی نے آبدیدہ آواز میں کہا۔

سانپ کی مورتی کی کہانی کو عام عوام سے چھپا لیا گیا تھا مگر پروفیسر کی موت اور ان کے ماتحتوں کی ہلاکت نے شہریوں پر کافی برا اثر ڈالا تھا۔ بات تو اس پر ختم نہیں ہوئی تھی کہ اب عام شہری بھی اس موذی سانپ کا شکار ہونے لگے تھے۔

☆......☆......☆

دروازہ اکبر نے کھولا تھا۔ دروازے پر اجنبی صورت دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔

''کون ہو بھائی۔''

''ایک ہمدرد۔'' جواب مسکرا کر دیا گیا تھا۔

''بھائی، یہاں کسی ہمدرد کی ضرورت نہیں ہے۔'' اکبر نے گرم ہو کر جواب دیا۔

''جانتا ہوں۔ میں صرف درگوش صاحب کے لئے پیغام لے کر آیا ہوں۔''

''اندر آنے دو اکبر۔'' درگوش نے یہ سنتے ہی کہا۔

وہ ایک اجنبی تھا جس کے جسم پر نہایت ہی معمولی قسم کا لباس موجود تھا۔ درگوش کے لئے وہ بالکل ہی اجنبی تھا۔

''کون ہو تم اور مجھے کیسے جانتے ہو۔''

"میں بڑے سرکار کا خادم ہوں۔ آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کو بہت بار ڈیرے پر دیکھا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اوہ تو تم کو بڑے سرکار نے بھیجا ہے۔"

"نہیں طوسیہ بی بی نے۔"

"کیا۔" درگوش چونک گیا۔

"جی ہاں۔" اس نے سر ہلایا اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ دیتے ہی وہ چپ چاپ ہی باہر نکل گیا تھا۔ درگوش نے اس کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ لفافے میں سے ایک تحریر برآمد ہوئی تھی جو کہ ٹائپ شدہ تھی۔

"جان طوسیہ۔ جیسے ہی یہ خط ملے تو تم فوراً ہی نیلم کے گھر چلے آؤ۔ میں تم کو وہیں ملو گی۔ لیکن بابا کو اس بات کی بالکل بھی خبر نہیں اور جب تک ان کو پتا چلے میں یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہتی ہوں۔"

تمہاری طوسیہ

درگوش بجلی کی تیزی سے نیلم کے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ نیلم نے کھولا تھا۔

"ارے بھائی جان۔" اس کی آواز میں خوشی نمایاں تھی۔

"ہاں۔ اور تم سناؤ کیسی ہو۔" درگوش نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آج طوسیہ آئی ہے تبھی تو آپ یہاں ورنہ بہن یاد کہاں تھی آپ کو۔" نیلم منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئی۔ ایسی بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں کچھ دنوں سے عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوں۔ کبھی ایک چکر سے نکلتا ہوں اور دوسرا شروع ہو

جاتا ہے۔اور دوسرے سے تیسرا۔"

"ہوا کیا۔"

"کچھ نہیں فی الحال معطل کر دیا گیا ہوں۔" گیلری میں پھولوں کی کیاریوں کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔

"ہوا کیا ہے؟" نیلم نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔بس اس پراسرار سانپ کا چکر ہے۔جس نے چند پولیس والوں کو ہلاک کر دیا تھا۔"

"ہاں سنا تو میں نے بھی تھا۔"

"کس سے؟" درگوش نے سوال کیا۔

"آپ کے وہ بتا رہے تھے۔" وہ شرما کر بولی۔

"وہ کون۔" درگوش مسکرایا۔

"آپ کے بہنوئی۔"

"اوہ اچھا۔لیکن حضرت ہیں کہاں۔"

"جاب پر ہیں۔"

"اور طوسیہ۔"

"وہ اندر کمرے میں۔چلیں۔"

اور پھر وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔طوسیہ اس کو دیکھ کر اُٹھ کھڑی۔اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ ملاقات خلاف توقع ہوئی ہے۔اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی نظر آ رہی تھی۔

"ارے آپ یہاں۔آپ کو کیسے پتہ میں یہاں ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اب حیران ہونے کی باری درگوش کی تھی۔ "تم نے بلایا ہے مجھے ایک خط کے ذریعے۔"

"لیکن میں نے آپ تو کوئی خط نہیں لکھا۔"

درگوش کی حیرت مزید بڑھ گئی۔اس سے قبل وہ کچھ بولتا عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی

"وہ آگئے۔" نیلم جلدی سے بولی۔ "جب تک میں ان کو لے کر آتی ہوں آپ لوگ آپس میں فیصلہ کرلیں کس نے کس کو بلایا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔اس کے جاتے ہی درگوش نے جیب سے وہ خط نکالا اوراس کو طوسیہ کے حوالے کردیا۔طوسیہ جیسے جیسے وہ خط پڑھتی جاتی اس کے چہرے پر حیرت بڑھتی ہی جاتی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔اگر میں خط لکھوں گی تو ٹائپ کیوں کروں گی۔میرے پاس تو کمپیوٹر ہے ہی نہیں۔میں نیلم سے ملنے آئی تھی بابا نے خود کہا تھا جاؤ مل آؤ۔"

"اوہ۔تو یہ کسی کی چال ہے۔" درگوش بڑبڑایا۔اسی لمحے نیلم اندر داخل ہوئی۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس پر تنویمی عمل کردیا ہو۔یوں لگ رہا تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔چہرا بالکل ہی سفید پڑا ہوا تھا۔درگوش اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے نیلم کے عقب میں چار نقاب پوشوں کو دیکھا جنہوں نے نیلم کو کور کیا ہوا تھا۔یہ منظر دیکھ کر طوسیہ کی چیخ نکل گئی۔

"خاموش کھڑی رہو، زیادہ شور تمہارے چہرے پر تیسری آنکھ بنا سکتا ہے۔" ایک نقاب پوش غرایا۔

"مسٹر درگوش! ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے صرف ہم کو وہ مورتی درکار ہے اور بس۔

ان لڑکیوں کو مار بھی سکتا ہوں۔ کیونکہ تمہاری گردن پر میرے تین ساتھیوں کا خون ہے۔ باس کا حکم ہے مورتی نہیں ملی تو ان لڑکیوں کو ٹھکانے لگادو۔"

"اوہ۔" درگوش ہنسا۔ "تم ان چاروں میں سے ایک ہو۔ جو اس سانپ کا شکار ہوئے تھے مگر تم بچ کیسے گئے اور تمہارا چوہا باس سامنے آ کر مجھ سے بات کرے۔"

"شاید ابھی میری موت کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے بچ گیا۔ اور باس کی بات وہ چھوٹے موٹے آدمیوں سے بات نہیں کرتا۔"

"یاد رکھنا ایک دن یہی چھوٹا آدمی تمہارے باس کی موت کی وجہ بنے گا۔ وعدہ ہے میرا۔"

"بکواس بند کرو۔ اور مورتی کہاں ہے یہ بتاؤ۔ میں دس تک گنوں گا۔ اس کے بعد ان دونوں کی لاشیں اسی جگہ تڑپ رہی ہوں گی۔"

صورت حال درگوش کے لئے کافی خطرناک اور تشویش ناک تھی۔ نقاب پوش کے عزائم یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس پر ضرور عمل کرے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ ایک تمہاری بہن ہے دوسری تمہاری محبت۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔" نقاب پوش نے ہنس کر کہا۔ طوبیٰ اور نیلم درگوش کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس نقاب پوش نے گنتی شروع کر دی تھی اور درگوش کا ذہن صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس سے قبل گنتی پوری ہوتی، یک بیک تین فائر ہوئے۔ نقاب پوشوں کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر اچھلے اور دور جا گرے۔ ایک نقاب پوش کے ہاتھ سے خون بھی جاری ہو گیا تھا۔ فائر کی سمت دیکھ کر درگوش چونک گیا۔

فائر کمرے میں موجود کھڑکی سے ہوئے تھے جو کہ بائیں طرف والی دیوار میں لگی ہوئی

تھی۔ کھڑکی کے دوسری طرف بڑے سرکار اپنے ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ان کا انداز بڑا ہی شاہانہ تھا پھر وہ کھڑکی سے کود کر اندر آ گئے۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میرا اگلا نشانہ تم چاروں کی کھوپڑیاں ہونگی۔" بڑے سرکار نے غرا کر کہا۔ پھر وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ بڑے سرکار کے لبوں پر بڑی ہی شاندار قسم کی مسکراہٹ تھی۔ درگوش کافی غور سے اس کو دیکھ رہا تھا یہ روپ اس کے لئے بالکل ہی نیا تھا۔

بڑے سرکار نے بڑے ہی والہانہ انداز میں اس کو گلے لگایا تھا۔

"ارے بابا، کہاں ہو تم نظر ہی نہیں آتے۔" بڑے سرکار نے مسکرا کر کہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے والے واقعے کا انہوں نے کوئی خاص اثر ہی نہیں لیا ہے جبکہ وہ دنوں لڑکیاں سکتے کی سی کیفیت میں تھیں۔

"ارے نیلم بیٹی، ہم تمہارے گھر میں ہیں۔ کوئی چائے وغیرہ بھی نہیں پوچھو گی ہم سے۔"

اتنا سننا تھا کہ نیلم اور طوسیہ بڑے سرکار کو عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ درگوش اب بھی بڑے سرکار کو بغور دیکھے ہی جا رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچے۔

"آپ یہاں کیسے پہنچے؟" درگوش نے کھوجتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں طوسیہ کو لینے آیا تھا۔ گیٹ کھلا دیکھا تو ماتھا ٹھنکا اندر داخل ہوا تو دیکھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ اس کی بات سن کر وہ خاموش ہی رہا۔ نہ جانے کیوں بڑے سرکار کی یہ توجیہہ اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کو شروع سے ایسا لگتا تھا کہ بڑے سرکار جو نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں۔

"کس سوچ میں گم ہو گئے۔" بڑے سرکار نے اس کو سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔

”نہیں کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ طوسیہ کو آئے تو صرف آدھا گھنٹہ ہوا ہے اور آپ اس کو لینے بھی آ گئے۔“

”تم پولیس والوں کی شک کرنے کی عادت بھی جاتی نہیں۔ ارے بھئی وہ میری بیٹی ہے۔ میں جب چاہوں آ سکتا ہوں۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”اب میں پولیس والا نہیں رہا معطل کر دیا گیا ہوں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”ایسا تو محکمہ میں ہوتا ہی رہتا ہے۔“ درگوش ہنس کر بولا۔

”مگر کوئی تو وجہ ہو گی۔“

”اچھا آپ پوچھ رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔ ایک مورتی کی وجہ سے۔“

”مورتی۔“ بڑے سرکار نے چونک کر کہا۔ اس طرح چونکنے پر درگوش حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا کیونکہ وہ بڑے ہی غیر معمولی انداز میں چونکے تھے۔

”بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ ایک مورتی لگی تھی، سانپ کی مورتی مگر وہ مورتی ہرگز مورتی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ بڑے سرکار نے اس کو غور سے دیکھا۔ درگوش نے طویل سانس لے کر اس کو مورتی کے بارے سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح وہ اس کے ہاتھ لگی اور کس طرح اس کے ساتھی پولیس والے اور نقاب پوشوں کی ہلاکت ہوئی۔ درگوش نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ اپنی داستان سنا رہا تھا، بڑے سرکار نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

”کیا اب وہ مورتی تمہارے پاس ہے؟“ بڑے سرکار نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں وہ مورتی اب ڈی ایس پی صاحب کی تحویل میں جا چکی ہے۔“

”ہے تو تمہاری ہی برادری میں۔“

”لیکن اب میں پولیس والا نہیں ہوں۔“

اس کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔اس کی نظریں بڑے سرکار کے تفکر بھرے چہرے پر تھیں۔

”اگر وہ مورتی تمہارے ہاتھ لگ جاتی تو اس کو فروخت کر کے تو میں طوسیہ کے باپ کی خواہش کو تم سے منسوب کر دیتا۔“

اسی لمحے طوسیہ اور نیلم چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

”مورتی اُٹھانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں طوسیہ کو حاصل کر سکوں۔“

”میں اس مورتی کا خریدار لا سکتا ہوں بشرطیہ تم اس کو پھر لا سکو۔“ بڑے سرکار نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یہ تو ناممکن ہے۔ ویسے بھی اصولاً مجھے حوالات میں ہونا چاہیے تھا اور میں وہاں سے غائب ہوں۔“

”یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ مورتی تمہارے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔تم فکر نہ کرو جب تک میں ہوں کوئی قانون والا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

درگوش نے کوئی جواب نہ دیا اور چائے کا کپ اُٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا۔اس کا ذہن تیزی سے آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔اچانک بڑے سرکار کے دوبارہ بولنے پر وہ چونک گیا وہ کہہ رہے تھے۔

”تم چاہو تو میرے ڈیرے پر رہ سکتے ہو۔ جہاں پولیس تو کیا پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“

درگوش نے اسکی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ بڑے سرکار کو کیا جواب دے۔ بڑے سرکار بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”جواب دو۔کیا سوچ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں سوچ رہا ہوں، طوسیہ کی موجودگی میں میرا رہنا آپ کو بعد میں برا تو نہیں لگ جائے گا۔اور دوسری بات میرا زیادہ غائب رہنا مجھے قانون کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا ہے۔“

”اس کی فکر چھوڑو۔تم کو پولیس وقتی طور پر ضرور تلاش کرے گی لیکن اس کے بعد سب لوگ سب کچھ بھول جائیں گے۔اس کے بعد اگر ہم نے مورتی حاصل کر لی تو ہم ایک دوسری زندگی شروع کر سکتے ہیں پھر طوسیہ تمہاری ہوگی۔“

☆......☆......☆

شہر بھر میں خوف و دہشت کا ماحول تھا۔سر شام لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے۔ سانپ کے کاٹنے کی وارداتیں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔پہلے دن فٹ پاتھ پر سوئے چار آدمیوں کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ان چاروں کی لاشیں سوجی ہوئی فٹ پاتھ پر پائی گئی تھیں۔شہر بھر میں گشت بڑھا دیا گیا تھا۔سانپ کی تلاش پورے شہر میں جاری تھی۔

اس کا نام فضلو تھا۔اس کی عمر چالیس برس کے نزدیک تھی۔اپنی چالیس سالہ زندگی اس نے چرس کے دھویں میں ہی گزار دی تھی۔اس وقت وہ بھی اپنے گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود گھر سے باہر نکل آیا تھا۔اس کا ارادہ اپنے دوستوں میں جا کر چرس پارٹی کرنے کا تھا۔ ان کی چرس پارٹی اکثر قبرستانوں میں ہوا کرتی تھی۔

رات کے بارہ بجے تھے۔فضلو اپنی ہی دھن میں گاتا ہوا جا رہا تھا۔اچانک اس کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔چونکہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا اس لئے اس کو چوٹ کچھ زیادہ ہی لگی تھی۔گرتے ہی اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان جاری ہو گیا تھا۔بدقت ہی وہ اُٹھا، اچانک اس کی نظر ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔اسی سے وہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا جیسے ہی وہ

اس کے نزدیک پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہ چمکتی ہوئی چیز سونے کے سانپ کی مورتی تھی جس کی آنکھوں میں جڑے ہیروں سے نکلتی ہوئی چمک بے حد تیز تھی۔ فضلو سمجھ ہی نہ سکا یہ روشنی کیا ہے۔ اچانک اس نے ہاتھ بڑھا کر اس مورتی کو تھام لیا۔

مورتی کو تھامتے ہی فضلو کو احساس ہوا کہ اس نے جس چیز کو ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے وہ بہت گرم ہے، اس نے گھبرا کر اس مورتی کو واپس سڑک پر پھینک دیا۔ مورتی کے گرتے ہی ایک تیز قسم کی آواز فضلو کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ آواز سیٹی سے مشابہہ تھی۔ فضلو نے ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اچانک اس کی نظر اس جگہ پر پڑی جہاں اس نے مورتی کو پھینکا تھا۔ وہاں ایک سنہرا سانپ بل کھا رہا تھا جس کی جلد سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ فضلو کی آخری چیخ بے حد ہی دردناک تھی۔ دوسری صبح فضلو کی بھی نیلی لاش سڑک پائی گئی تھی اور پولیس پھر بے بس تھی۔

☆......☆......☆

پولیس کے اعلیٰ حکام پریس اور میڈیا کو جواب دے دے کر تھک گئے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے نامی گرامی سپیروں نے بھی کوشش کر لی تھی مگر ناکامی ہی ہاتھ آئی تھی۔ سر شام اب شہر میں سناٹا نظر آنے لگا تھا۔ کچھ لوگ ان وارداتوں کو قہر الٰہی سے تعبیر کرنے لگے تھے اور کچھ لوگ ان کو جادو ٹونا کا اثر قرار دے رہے تھے۔ غرض جتنے منہ اور اتنی باتیں۔ ڈی ایس پی اپنے آفس میں پریشان بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یک بیک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور وہ آپ ہی آپ چونک اٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر انٹرکام اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔

"انسپکٹر حماد کو فوراً بھیجو۔"

اتنا کہہ کر اس نے انٹر کام رکھ دیا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایس ایچ او اس کے سامنے حاضر تھا۔ حماد یوں ٹکٹکی باندھے اپنے آفیسر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ اس کو بلا کر جیسے بھول گیا تھا۔ اس نے دیکھا ڈی ایس پی نہایت ہی گہری سوچ میں گم ہے کہ اس کو اپنے گرد و پیش کا ہی احساس نہیں۔ آخر کار حماد نے اس کو کھنکار کر مخاطب کیا جس سے وہ چونک گیا تھا۔ ڈی ایس پی نے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں تو درگوش کی کیا رپورٹ ہے۔''

''سر، وہ تا حال گھر پر نہیں ہے۔ کئی بار پولیس پارٹی جا چکی ہے مگر کوئی کامیابی نہیں ملی۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''یس سر۔ آپ حکم کریں تو وارنٹ جاری کروا دیتا ہوں۔''

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ مجرم نہیں ہے بس لالچ اس پر حاوی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے وہ مورتی نکال لی ہو گی۔ اس نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ مجھے پروفیسر درانی کی موت کے بعد سچ لگ رہا ہے۔''

''سر میں سمجھا نہیں۔''

''رکو۔ میں سمجھاتا ہوں۔ پروفیسر اور اس کے اسسٹنٹ کی موت سانپ کے زہر سے ہوئی لیکن سانپ بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی نہیں ملا۔ اس کے بعد سانپ کی مورتی کمرے میں نہ ہونے کا مقصد وہ غائب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور درگوش کے چار ساتھی بھی کسی سانپ کے کاٹنے سے مرے ہیں اور مجھے لگتا ہے، سانپ اور مورتی میں کوئی گہرا تعلق ہے۔''

”جی سر، یہ تو ہے۔“

”اور جب سے درگوش لاپتہ ہوا ہے ان اموات میں اضافہ ہوا ہے۔ تم یوں کرو کسی عالم کو ڈھونڈ واور درگوش کو بھی، اس کی واپسی فوری ضروری ہے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں کہ درگوش اور کسی عالم کو ڈھونڈ سکوں۔“

”کوشش سے کام چوری کی بو آتی ہے۔ کوشش نہیں مجھے رزلٹ کی ضرورت ہے۔ عوام کی جان و مال کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے میں ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ تجربہ۔“

”جی سر۔“

☆......☆......☆

درگوش، طوسیہ کے لئے بڑے سرکار کے یہاں چلا آیا تھا۔ وہ ہرگز نہ آتا مگر محبت کرنے والے اپنے محبوب کے نزدیک رہنا ہی سعادت سمجھتے ہیں۔ یوں تو اس کو اپنے گھر کا بھی خیال آیا تھا۔ نہ جانے اکبر کس حال میں ہوگا؟ پولیس والے اس کو ضرور تنگ کر رہے ہوں گے۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اب وہ لیٹا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے آپ کو پولیس کے سامنے حاضر کر دینا ہوگا ورنہ ہو سکتا ہے کہ پولیس اس کو مفرور قرار دے دے۔ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی، وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا تو اندر داخل ہونے والی طوسیہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے موجود تھی۔

”تم۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں ایسی بات نہیں۔ اگر تم کو کسی نے یہاں دیکھ لیا تو نہ جانے کیا سمجھیں گے۔“

”بھلے سے دیکھ لے۔ میری بلا سے۔“ طوسیہ نے لاپرواہی سے کہا۔ درگوش نے کوئی

جواب نہیں دیا بس اس کی طرف یک ٹک ہی دیکھتا رہا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”سوچ رہا ہوں کہ تم اتنی حسین کیوں ہو۔“

اس کی بات سن کر وہ شرما گئی اور اس کی نظریں از خود جھک گئیں۔

”سارا حسن تو آپ کی نگاہوں میں ہے جس نے مجھ جیسی معمولی لڑکی کو خاص بنا دیا ورنہ میں کس قابل۔“

”ایسا مت کہو۔“ درگوش نے تڑپ کر کہا۔ ”تم نہیں جانتی تم میرے لئے کیا ہو۔ تمہارے لئے تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“

اس کی بات سن کر وہ تڑپ گئی اور پھر دھیرے سے بولی۔

”ایسا مت کہیں، مریں آپ کے دشمن۔“ اتنا کہہ کر اس نے درگوش کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی درگوش نے اپنے اندر ایک کرنٹ سا دوڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس کو یوں لگا کہ جیسے اس کی رگوں میں بہنے والے خون کی رفتار کئی گنا تیز ہو گئی ہو۔ اس نے دھیرے سے طوسیہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”بڑے سرکار کہاں ہیں۔“

”وہ کہیں باہر گئے ہیں اور جلد واپسی کا امکان بھی نہیں ورنہ کھانا آپ کو ان کے ساتھ کھانا پڑتا۔ اور میں بھی موقع دیکھ کر آپ کی وجہ سے آئی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ایک بات بتاؤں میں بھی تمہاری ہی وجہ سے آیا ہوں ورنہ شاید میں کبھی بھی نہ آتا۔“

”مگر بابا تم پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے۔“

”ہاں حیرت تو ہے اس بات پر مجھے بھی۔ مجھے وہ لمحہ آج بھی یاد ہے جب نیلم کے ولیمہ

میں تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔'' درگوش نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں حیرت تو مجھے بھی ہے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔'' درگوش جلدی سے بولا ''کھانا مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤ۔''

''ناں بابا۔ خود کھاؤ تم بچے نہیں ہو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔''

''اچھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔''

''مجھے کسی کی پروا نہیں۔''

''اوہ۔ تو بڑا دبدبہ ہے تمہارا۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں۔ یہاں کے قوانین ہی کچھ ایسے ہیں۔''

''اچھا۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا واقعی یہ عیش و عشرت اس لئے ہے کہ بڑے سرکار کا تعلق کسی نواب گھرانے سے ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک گئی۔

''کیا ان کے باپ دادا خاندانی امیر ہیں۔''

''کہاں کا خاندان، کیسا خاندان، میں نے آج تک ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک ان کو اکیلا ہی دیکھا ہے۔''

اب حیران ہونے کی باری درگوش کی تھی کیونکہ بڑے سرکار نے اپنے متعلق اپنے خاندان کے متعلق کافی کچھ بتایا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔''

''کیوں۔''

”مجھے اپنے بارے میں انہوں نے بہت کچھ بتایا تھا۔“

”وہ جھوٹ بولتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں نفرت دبی ہوئی تھی۔ ”لیکن اتنا جانتی ہوں وہ بہت زیادہ گہرے ہیں۔ اتنے گہرے کہ میں آج تک ان کو خود نہیں جان سکی۔“ طوسیہ کا لہجہ نفرت بھرا تھا۔ طوسیہ کے لہجے کی نفرت محسوس کر کے درگوش خود بھی حیران ہوا تھا کہ اس قدر نفرت کیوں۔

”پھر یہ ٹھاٹ بھاٹ۔“

”یہ سب کچھ میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور معلوم ہے۔ ان کے تعلقات بہت زیادہ وسیع ہیں۔ آئے دن ان کے پاس بڑی مہنگی گاڑیوں میں لوگ آتے ہیں۔“

”اچھا۔“ درگوش حیرت سے بولا۔

یہ ایک بالکل نئی بات سامنے آئی تھی۔ اب تو ان کی شخصیت اور زیادہ پراسرار معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کو وہ منظر یاد آنے لگا تھا جب انہوں نے تین فائر کیے تھے لیکن مجال ہے جو نشانہ چوکا ہوا۔ درمیان میں کوئی پراسرار باس بھی تھا جس نے باکس اسمگل کروایا ہو؟ مگر کہاں سے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بڑے سرکار کا بھی اسمگلنگ سے کوئی تعلق ہو؟ بہرحال بہت سی الجھنیں تھیں جن کو سلجھانا بہت ضروری تھا۔

طوسیہ تھوڑی ہی دیر تک اس کے پاس رہی اور پھر چلی گئی۔ دوسرے دن جب وہ سو کر اُٹھا تو مراد کی صورت اس کو دکھائی دی۔

”حضور۔ بڑے سرکار ناشتہ پر یاد کر رہے ہیں۔“

”اوہ۔ کہاں۔“

”آپ فریش ہو جائیں میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔“

فریش ہونے کے بعد درگوش مراد کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک میز کے گرد بہت سی کرسیاں موجود تھیں۔ کمرے کی ڈیکوریشن واقعی بہت ہی زیادہ دیدہ زیب تھی۔ میز پر ناشتے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ چائے، پراٹھے، آلو کا سالن، حلوہ پوری غرض ہر شے موجود تھی۔ درگوش نے میز پر بیٹھتے ہوئے بڑے ہی غور سے بڑے سرکار کو دیکھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ انسان عمر کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکا ہے۔ کس قدر توانائی تھی اس چہرے پر۔

''بابا آؤ۔ میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کل رات ذرا دیر سے واپسی ہوئی تھی اس لئے رات کا ڈنر تمہارے ساتھ نہیں کر سکا۔ ابھی بھی مجھے کہیں جانا ہے اس لئے سوچا کہ ناشتہ ہی تمہارے ساتھ ہو جائے۔ اس طرح میزبانی کا فرض ہی ادا ہو جائے گا۔''

''میزبان۔''

''ہاں بھئی تم ہمارے مہمان ہو اور مہمان کا خیال رکھنا تو میزبان کا فرض ہوتا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ فی الحال تو گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔''

''ارے ایسی بات نہیں۔'' وہ ہنسے۔ ''تم چاہو تو اس سانپ کی مورتی کو حاصل کر کے کروڑ پتی بن سکتے ہو۔ بس وہ ایک دفعہ ہاتھ لگ جائے۔'' انہوں نے حسرت سے کہا۔

بڑے سرکار کے لہجے میں بے پناہ طلب اور حسرت محسوس کر کے وہ چونک گیا لگتا تھا کہ اس مورتی کی ضرورت اس سے زیادہ بڑے سرکار کو ہے۔ بڑے سرکار کی شخصیت اب مزید اس کی نظر میں متنازعہ ہو گئی تھی۔

''میں پوری کوشش کروں گا۔''

''ضرور۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھ

کھڑا ہوا۔

’’مجھے صرف تازہ اخبارات کی ضرورت ہے۔‘‘

’’ضرور۔مراد کو بتادو۔بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مورتی جلداز جلد تمہارے قبضہ میں آجائے تاکہ تمہاری شادی طوسیہ سے ہو سکے۔‘‘

درگوش نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ بس بڑے سرکار کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔دروازے پر پہنچ کر بڑے سرکار نے چونک کر کہا۔

’’یاد آیا۔شہر میں کسی پراسرار سانپ نے اودھم مچا رکھا ہے۔بہت سے معصوم لوگ مارے جا رہے ہیں۔‘‘

’’پراسرار سانپ۔‘‘درگوش چونک اُٹھا۔اس طرح چونکنے پر بڑے سرکار نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا تم اس سانپ کو جانتے ہو۔‘‘

’’بالکل۔میری ایک جگہ ڈیوٹی لگی تھی ساحل سمندر پر جہاں میرے ساتھی پولیس اہلکار اس موذی کا نشانہ بنے تھے۔‘‘

درگوش نے ساحل کے نام پر بڑے سرکار کو چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ صرف ایک پل کے لئے دوسرے پل ہی بڑے سرکار کے چہرے پر سکون ہو گیا تھا۔درگوش کے دل و دماغ میں بڑے سرکار کے آگے ریڈ لائن لگ گئی تھی۔

’’اچھا۔عجیب بات ہے۔‘‘

’’ہاں پھر کچھ لوگ میرے گھر میں گھس آئے تھے۔اسی مورتی کے حصول کے لئے جو مجھے اس ریڈ میں حاصل ہوئی تھی مگر وہ لوگ بھی مارے گئے۔‘‘

''اچھا۔'' بڑے سرکار نے عجیب سے لہجے میں کہا جس کو محسوس کر کے درگوش خود بھی چونک اُٹھا مگر اس نے محسوس نہ ہونے دیا۔

بڑے سرکار کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر بیٹھا ہی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچوں کا جال تنا رہا تھا۔ جب سے وہ فلیٹ سے باہر نکلا تھا تب سے ہی اس سانپ کی وارداتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ اپنے محکمہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر کر نہیں پا رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ پولیس نے اب تک اسکی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے ہوں گے۔ درگوش نے ڈی ایس پی کو سچ بتانے کی کوشش کی تھی مگر بھلا آج کے جدید دور میں جہاں انسان ترقی کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے بھلا کون یقین کرے گا کوئی سونے کی مورتی زندہ ہو کر انسانوں کا قتل کرتی پھر رہی ہے۔ اچانک ایک خیال کے پیش نظر وہ چونک اٹھا تھا۔ اس کو حماد سے ملنا ہوگا۔ حماد ہی تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے حماد سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر حماد کو سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ڈور بیل کی آواز سن کر وہ چونک پڑا تھا۔ غصہ تو اس کو بہت آیا تھا رات کی ڈیوٹی سے آنے کے بعد وہ ناشتہ کر کے سونے کی ہی کوشش کر رہا تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی تھی۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا کہ بجنے دو بجانے والا تنگ آ کر خود ہی چلا جائے گا لیکن جب بیل بجتی رہی تو وہ ناچار اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دو سال قبل پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ ساری فیملی گاؤں میں تھی اور وہ خود پولیس کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اب اس کی کوشش تھی کسی طرح گاؤں میں ٹرانسفر ہو جائے تا حال اس کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''کون ہے بھئی۔ آ رہا ہوں۔''

''یار حماد میں ہوں۔'' باہر سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ آواز سن کر وہ چونکا اور اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے درگوش کھڑا تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ درگوش کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں اور پھر وہ آگے بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

''کہاں تھا یار تو۔''

درگوش نے آہستہ سے اس کو خود سے الگ کیا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''تو سنا تیری طبیعت کیسی ہے، تیرے ٹرانسفر کا کچھ ہوا کہ نہیں۔''

''مجھے چھوڑ۔ یہ بتا تو کہاں تھا آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی۔ میں نے کتنی جگہوں پر تجھ کو تلاش کیا۔''

''مجھ گرفتار کرنے کے لئے۔'' درگوش مسکرایا۔

''میرا ابھی یہی خیال تھا کہ تم اسی وجہ سے انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہو۔ مگر تم کو سچ معلوم نہیں ہے۔''

''مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یار تم اندر تو آؤ۔ کیا ساری داستان دروازے پر ہی سنا دوں۔''

حماد نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی پھر دونوں ہی بستر پر بیٹھ گئے تھے۔

''ہاں اب معاملہ کیا ہے ذرا کھل کر بیان کر۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔

''یار۔ تم ایک بات بتاؤ، تم نے آخر مورتی وہاں سے اٹھائی ہی کیوں۔'' حماد نے درگوش کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی بات پوچھ لی۔

''بس یار۔ محبت۔ محبت کے لئے انسان کیا نہیں کرتا۔ کبھی دودھ کی نہریں کھودتا ہے اور کبھی پاگلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا ہے۔''

اس کی بات سن کر حماد ہنس پڑا۔

”سمجھ گیا جانو۔اس کے باپ نے تیرے امیر ہونے کی شرط رکھ دی ہوگی اور مورتی تجھ کو سب سے آسان ٹارگٹ لگا ہوگا۔اور تُو نے سوچا ہوگا کہاں چھوٹے چھوٹے کھانچے ایک ہی بار ہاتھ مارلو وارے نیارے ہیں۔“

درگوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب تم مٹھائی کھلا دو کیونکہ ڈی ایس پی صاحب نے تم کو معاف کر دیا ہے۔فی الحال آپ ڈیوٹی سرانجام نہیں دے سکتے مگر اپنے فلیٹ میں ضرور آسکتے ہو۔“

”ارے۔یہ کیسے ہوا۔میں تو خود کو ایک اشتہاری مجرم سمجھ رہا تھا۔“

”دو ہی دن قبل آرڈر جاری ہوا ہے۔اور امید ہے جلد ہی تم بحال ہو جاؤ گے۔“

”کیا واقعی۔“

حماد نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”ایک بات کہوں جب تم بحال ہو جاؤ ایک بار ضرور اس رشوت خوری والی زندگی سے توبہ کر لینا۔وہ بڑا کارساز ہے معاف کر دے گا۔اس محکمہ کا ماحول ہی کچھ ایسا ہے خرچہ پانی نہ لو تو انسان اس میں ڈھل نہیں سکتا۔مگر یہ ڈی ایس پی بہت اچھے انسان ہیں مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد اس لعنت کو محکمہ سے ختم کر دیں گے۔“ حماد کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو حماد۔میں بھول گیا تھا کہ ایک دن موت کا مزا سب نے چکھنا ہے۔اگر زندگی نے وفا کی اور نوکری پر بحالی ہوئی تو ایمانداری سے کام ضرور کروں گا۔“

درگوش کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

”یار ناشتہ کیا تم نے۔“

”ہاں یار کر کے نکلا تھا۔“

’’کہاں ہو اتنے دن سے؟‘‘

’’بس یار کبھی یہاں کبھی وہاں۔‘‘ درگوش نے بات بنائی۔ ’’میں خود کو خانہ بدوش تصور کر رہا ہوں۔‘‘

اچانک درگوش نے حماد کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

’’یار میں ایک بات بتانا بھول گیا۔‘‘

’’کون سی بات۔‘‘

’’یہی کہ تمہاری بات پر ڈی ایس پی صاحب کو یقین تب آیا تھا جب انہوں نے پروفیسر درانی کی لاش دیکھی۔‘‘

’’کیا۔ پروفیسر کی لاش۔ یہ کب ہوا؟‘‘

’’ڈی ایس پی نے مورتی پر ریسرچ کے لئے پروفیسر درانی کو بلایا اور مورتی ان کو دی۔ جب اس کمرے کا دروازہ توڑا گیا تو درانی اور ان کا اسسٹنٹ مرے ہوئے پائے گئے۔‘‘ حماد کا لہجہ ڈرامائی ہو گیا۔ اسکی بات سن کر درگوش کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی تھی۔

’’اس کا مطلب۔ یہ مورتی شہر میں ہونے والے تمام اموات کی ذمہ دار ہے۔ اور میرے ساتھی پولیس والوں کی موت کی بھی۔‘‘

’’ایسا تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس۔‘‘ حماد نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ثبوت تو کوئی نہیں بس یہ میرے دل کی آواز ہے۔‘‘

’’قانون دل پر نہیں چلتا میری جان۔‘‘

’’اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ جب درانی کی لاش ملی تو وہاں وہ مورتی تھی یا نہیں۔‘‘

"نہیں یار مورتی تو نہیں تھی۔ البتہ ڈی ایس پی صاحب کی سوچ کا زاویہ ضرور بدل گیا ہے۔" حماد نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب۔"

"ایک تو انہوں نے تم کو معاف کر دیا اور دوسرا کسی عالم کو بلانے کو کہا ہے۔"

اس کی بات پر درگوش بے ساختہ مسکرا اُٹھا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب پولیس والوں کا کام بابا لوگ کریں گے۔"

جواباً حماد بھی مسکرانے لگا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"یار ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ مورتی آئی کہاں سے تھی اور جس باکس میں وہ سامان تھا وہ کس کا تھا۔"

جواباً درگوش نے لاعلمی کے اظہار میں شانے اچکا دیے تھے۔

"میں ابھی چلتا ہوں انشاءاللہ کل ڈی ایس پی صاحب سے ضرور ملوں گا۔"

"ضرور ملنا ویسے بھی کل ایک عالم صاحب ڈی ایس پی صاحب سے ضرور ملیں گے۔"

"کون ہے وہ؟"

"پتہ نہیں میں نہیں جانتا۔ ان کے سیکرٹری کو ضرور معلوم ہوگا۔ وہی لایا ہے پکڑ کر۔"

☆......☆......☆

رات ہو چکی تھی۔ درگوش نے سارا وقت ہی بڑے سرکار کے ڈیرے پر اخبارات پڑھتے ہوئے گزار دیا تھا۔ ایک دو بار طوسیہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ جیسے ہی بڑے سرکار آئے انہوں نے اس کو اپنے کمرۂ خاص میں بلا لیا تھا۔ درگوش نے حماد سے کی ہوئی ملاقات کا احوال گوش گزار کرنا شروع کیا۔ وہ بڑی ہی دلچسپی سے اس کی روداد سن رہے تھے۔ آخری مرحلہ پر تو

ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوگئی تھی جیسے کہ وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ گئے ہوں۔ درگوش نے جان بوجھ کر درانی کی موت اوراس عامل کا تذکرہ حذف کر دیا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی چیز ہے کہ تم اپنے آفیسر سے ملو۔''

''میں کل وہاں جاؤں گا۔''

''بالکل جاؤاور کوشش کرو کہ وہ مورتی تم کومل جائے۔''

''مگر وہ مورتی تو پراسرار خاصیت کی حامل ہے۔'' درگوش نے مسکرا کر کہا۔

''ہوگی۔ ہمیں کیا۔ میرے پاس ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جواس مورتی کوخرید سکتے ہیں۔ خاص کر ایسی مورتیاں بیرون ملک بہت مہنگی بک جاتی ہیں ڈالرز میں۔'' بڑے سرکار کی آنکھوں میں لالچ کی چمک بڑھ گئی۔

یہ سن کر درگوش خاموش ہی رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک عجیب سی سائرن نما آواز سنی۔ آواز سنتے ہی درگوش نے بڑے سرکار کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

''اب تم جاؤ رات کافی ہو چکی ہے۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔اورتم بھی سوجاؤ تا کہ کل تازہ دم ہوکر اپنے مشن پر نکل سکو۔''

درگوش وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس کو بڑے سرکار کا یوں چونکنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کوایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بڑے سرکار نے اس کو جان بوجھ کر وہاں سے بھگایا ہے۔ بڑے سرکار جو نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں۔ ان کی شخصیت اس کواور بھی پراسرار نظر آنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ایک عجیب سی آواز سن کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ آواز کچھ ایسی تھی کہ جیسے کوئی جھینگر ٹرایا

ہو۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ رنگ کے چیسٹر میں ملبوس تھا۔ بڑے ہی آرام وسکون سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے کسی بھی طرح کی عجلت ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ پھر وہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ پھر ایک راہداری کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ راہداری نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔ راہداری سے گزرنے کے بعد اب وہ ایک کھلی جگہ پر آچکا تھا۔ کافی دور جا کر اب وہ ایک خاص مقام پر آ کر رک گیا۔ اب وہ اسی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا پھر اس تین دفعہ تالی بجائی۔ فوراً ہی اس سے دو قدم کے فاصلے پر ایک خلا نمودار ہو گیا۔ اس خلا میں سوائے تاریکی کے کچھ اور نہ تھا لیکن وہ بے دھڑک ہو کر اس تاریکی میں نیچے اتر گیا۔

وہ سیڑھیاں تھیں جن پر وہ قدم رکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ پانچویں سیڑھی پر پہنچا خود بہ خود ہی چاروں طرف روشنی کی بوچھار ہو گئی۔ اب سب کچھ صاف اور واضح دکھائی رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک میز اور کرسی موجود تھی۔ دیوار پر ایک کمپیوٹر سکرین نصب تھی اور ساتھ میں ایک مائیک بھی موجود تھا۔ میز پر ایک بورڈ نصب تھا جس میں بے شمار قسم کے رنگ برنگی بٹن نصب تھے۔ کمپیوٹر سکرین ابھی آف تھی۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ جھینگر نما آواز پھر سنائی دی تھی جو کہ اسی ٹرانسمیٹر سے برآمد ہوئی تھی۔ سیاہ پوش نے ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔ فوراً ہی جیکی کی آواز سنائی دی۔

''باس۔ میں جیک بول رہا ہوں اوور۔''

''ہاں بولو۔ کیا بات ہے۔ اوور؟'' آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔

''باس! آج وہ درگوش انسپکٹر حماد سے ملا تھا۔''

''اچھا۔ پھر۔''

''باس! معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ حماد سے کیوں ملا تھا۔''

''تو یہ بتانے کے لئے مجھے فون کیا تھا۔ رپورٹ تمہاری ادھوری ہے۔'' باس کی آواز غصیلی ہوگئی۔

''سوری باس میرا خیال ہے کہ اس مورتی کے سلسلے میں ملا ہوگا اس سے۔''

''اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ اور تم بہت نکمے اور ناکارہ ثابت ہو رہے ہو۔ اب تک اس مورتی کے حصول کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔ بڑے سرکار جیسے ٹچے سے تم بھی ڈر کر بھاگ آئے تھے۔''

''سوری باس۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے اب سنو۔ اب آخری بازی کھیلنے کا وقت آگیا ہے۔ اس کے بعد درگوش خود ہمیں مورتی دے گا اور بڑے سرکار کے سارے ارمان دھرے رہ جائیں گے۔''

''وہ کیا پلان ہے باس۔''

اس کی بات سن کر سیاہ پوش کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے جیکی سے جو کچھ بھی کہا اس کو سن کر جیکی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

''پلان تو بہت جاندار ہے باس، اس سے گھی سیدھی انگلی سے ہی نکل آئے گا۔''

''ہاں تم اپنے سارے آدمیوں کو استعمال کرو۔ لاشوں کے ڈھیر بھی لگانے پڑیں تو لگا دو۔ یاد رکھو، یہ کام تب ہی ہوگا جب بڑے سرکار گھر میں نہ ہوں۔'' باس نے سفاکی سے کہا تھا۔

''اوکے باس۔ اوور اینڈ آل۔''

☆......☆......☆

ڈی ایس پی نے اس کو فوراً ہی اپنے آفس میں بلوا لیا تھا۔ درگوش کے ساتھ اس وقت حماد بھی موجود تھا۔ آفس میں اس وقت ایک آدمی اور بھی موجود تھا جو کہ سفید رنگ کے شلوار سوٹ

میں ملبوس تھا۔دونوں نے آفس میں داخل ہو کر سلام کیا جس کے جواب میں ڈی ایس پی صاحب نے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ان سے ملو یہ پروفیسر احمد شاہ ہیں ماہر عملیات۔'' ڈی ایس پی نے درگوش سے اس دوسرے آدمی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

درگوش نے اسکو سر سے پیر تک دیکھا تو اس کو وہ کافی سلجھا ہوا انسان معلوم ہوا تھا۔چالیس سے بیالیس برس کا یہ شخص اپنے حلیے سے کہیں سے بھی عالم معلوم نہیں ہوتا تھا۔وہ بڑے ہی غور سے درگوش کو دیکھ رہا تھا۔

''ان کو میں نے بلوایا ہے تاکہ اس مورتی کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں۔'' ڈی ایس پی نے مسکرا کر کہا۔درگوش نے کوئی جواب نہ دیا بس وہ تو خاموش ہی تھا۔

''ارے تم کچھ کہو گے نہیں اس بارے میں۔'' ڈی ایس پی نے جلدی سے کہا۔

''سر، میں شرمندہ ہوں اپنی اس حرکت پر۔''

''کوئی بات نہیں، تم بھی انسان ہو۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے۔میرے خیال سے اگر تم اس مورتی کو اس باکس سے نہ نکالتے تو بھی ایسے واقعات پیش ضرور آتے۔''

''بہت شکریہ سر۔''

''کوئی بات نہیں۔سب سے بڑی عدالت انسان کا اپنا ضمیر ہے۔رشوت خوری، بے ایمانی تو ہم اپنی زندگی میں کر لیں گے۔اور شاید پکڑے بھی نہ جائیں مگر یاد رکھنا وہ سب دیکھ رہا ہے۔'' ڈی ایس پی کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''شکریہ سر، میں وعدہ کرتا ہوں اب سے ایسا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے اوکے۔آگے سے خیال رکھنا۔'' ڈی ایس پی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ کسی

خیال کے پیش نظر چونک پڑا اور پھر شرمندہ سا ہو کر بولا۔

''سوری میں چائے یا کافی کا کہنا بھول ہی گیا تھا۔'' اتنا کہہ کر اس نے انٹرکام پر چائے کا آرڈر دیا اور پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بدستور بڑی ہی دلچسپی سے درگوش کو دیکھ رہا تھا۔

''تو پروفیسر شاہ، کیا سوچا آپ نے۔'' ڈی ایس پی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''میں تیار ہوں۔ مگر کام شروع کرنے سے پہلے تو مورتی کی ضرورت پڑے گی۔'' شاہ بدستور درگوش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

درگوش کو اس بات پر بڑی ہی حیرت تھی کہ شاہ اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور کیوں اس طرح اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ بات اس کے لئے کافی حیران کن تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ آفس کا دروازہ کھلا اور پیون چائے کی ایک ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ڈی ایس پی نے شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''وہ مورتی تو غائب ہو چکی ہے اب ہمارے پاس نہیں ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''پھر تو ناممکن ہے۔ ہاں اس مورتی کو سب سے پہلے ہاتھ اس نوجوان نے لگایا تھا۔'' اگر اس کے استعمال کی کوئی چیز مل جائے تو مدد مل سکتی ہے۔'' پروفیسر شاہ نے درگوش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

درگوش نے کچھ کہے بغیر اپنی جیب سے رومال نکال کر پروفیسر شاہ کے حوالے کر دیا تھا۔ پروفیسر شاہ نے اسی وقت ہی وہ رومال میز پر پھیلا دیا تھا اور اپنی جیب سے پانچ کونوں والا پیتل کا ایک ستارہ نکال کر رومال کے وسط میں رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا تھا۔

حماد اور ڈی ایس پی بڑی ہی دلچسپی سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے جبکہ درگوش کے لبوں پر حقارت بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو اس مورتی کے سامنے بڑے بڑے فیل ہو گئے تم کیا کر سکو گے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس رومال کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کو آگ میں تپا دیا ہو۔ یہی حال اس تکونے ستارے کا بھی تھا۔ درگوش نے دیکھا کہ پروفیسر کا چہرہ متغیر ہونے لگا ہے۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر سب ہی چونک پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔

"پانی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

درگوش نے آگے بڑھ کر فوراً ہی پانی پروفیسر کے سامنے کر دیا تھا جس کو وہ ایک ہی سانس میں پی گیا تھا۔

"کیا ہوا پروفیسر۔"

"وہ۔ وہ سس سونے کی مورتی نہیں۔" ان کے لہجے میں خوف تھا۔

"پھر کیا ہے۔" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا بس مجھے اتنا پتہ ہے کہ اس کے پاس بہت قوت ہے اور اس لڑکے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔" پروفیسر شاہ نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھ سے تعلق؟" درگوش چونک گیا۔

"میرا علم تو یہی کہتا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ بھلا میرا اس سے کیا واسطہ۔" درگوش نے چلا کر کہا۔

"میرا علم جھوٹ نہیں بولتا۔ کوئی تو ایسی بات ہے جو تم کو اس مورتی سے لنک کرتی ہے۔"

”میں اس مورتی کی تم سے تاریخ معلوم کرنا چاہتا تھا پروفیسر۔“ ڈی ایس پی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میرا علم بہت محدود ہے۔ لیکن میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ اناتھا ہے اور اناتھا کو مصری تاریخ میں دیوتا سمجھا جاتا تھا۔“

”اناتھا۔ یہ بڑا عجیب سا نام ہے۔ اور وہ مورتی ہے کہاں؟“ اس بار حماد بولا تھا۔

”ہوسکتا ہے تمہارے فلیٹ میں ہو۔ درگوش، ایک بار وہاں جا کر تو دیکھو۔“ ڈی ایس پی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں آپ۔“ درگوش نے کہا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا بس میرا دل کہہ رہا ہے۔“ ڈی ایس پی نے مسکرا کر کہا۔

درگوش کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اسی لمحے اس کے موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی تھی۔ اس نے جب موبائل سکرین دیکھی تو وہاں ایک نیا نمبر تھا جو کہ سیو نہیں تھا۔ درگوش نے فوراً ہی فون کو ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے آواز سن کر چونک پڑا تھا۔ آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کہ کوئی بھیڑیا غرایا ہو۔

”مسٹر آصف احمد درگوش۔“

”جی بول رہا ہوں۔“

”ہمارے درمیان جو چوہے بلی کا کھیل چل رہا ہے میں چاہتا ہوں وہ ختم ہو جائے۔“

”کیا مطلب۔ کون ہو تم۔“ درگوش نے تیز لہجے میں کہا۔

”میرے آدمیوں نے دو بار تم سے مورتی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ ملی اور اب میں چاہتا ہوں تم عزت سے میرے حوالے کر دو۔“

”اچھا تم باس ہو۔“ درگوش نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں تم نے ٹھیک پہچانا۔میں وہی ہوں جس کا سامان تم نے پکڑا تھا۔“

”اوہ۔تو مورتی تمہاری تھی۔“

”ٹھیک پہچانا تم نے۔“ دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

”میرا خیال ہے تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔“ درگوش نے سنجیدگی سے کہا۔

”بکواس بند کرو میرے آدمی گدھے تھے جو مورتی حاصل نہ کر سکے اب کام کی بات سنو۔ تمہاری جان جگر نور نظر میرے قبضہ میں ہے۔اگر تم دو گھنٹے کے اندر مورتی لے کر نادر محل نہیں پہنچے تو طوسیہ کی لاش تم کو مل جائے گی۔“

”بکواس بند کر مردود۔“ غصہ کی زیادتی کے سبب وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔

اسکے بعد فون بند ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا۔“ حماد نے پوچھا۔

”انہوں نے طوسیہ کو اغوا کر لیا ہے اب اس کے بدلے مورتی مانگ رہے ہیں۔“

”طوسیہ کون۔“ ڈی ایس پی نے فوراً پوچھا تھا۔

”بڑے سرکار کی بیٹی۔اس سے میری شادی ہونے والی ہے۔مورتی بھی میں نے اسی چکر میں چرائی تھی۔“

”ہوں۔تو پھر تم جاؤ فوراً اپنے فلیٹ، کہیں مورتی وہاں نہ ہو۔میں پولیس پارٹی کے ساتھ بڑے سرکار کے ڈیرے پر جاتا ہوں۔ہو سکتا ہے یہ خبر جھوٹی ہو۔“ ڈی ایس پی نے طویل سانس لے کر کہا۔

☆......☆......☆

دو گھنٹے کے اندر ہی پولیس پارٹی نے بڑے سرکار کے ڈیرے پر چھاپہ مارا تھا۔موبائل فون والی بات بالکل درست تھی۔ بڑے سرکار کے سارے آدمیوں کی لاشیں ان کو برآمدے میں ہی مل گئی تھیں جن کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔طوسیہ کے کمرے میں اس کی نوکرانی اس حالت میں ملی تھی کہ وہ بے ہوش تھی اور بے حد زخمی تھی لیکن زندہ تھی۔ بڑے سرکار اور طوسیہ کا کہیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔شاید ان لوگوں نے دونوں کو اغوا کرلیا تھا۔گویا اس کھیل کا اب خاتمہ ہونے والا تھا۔ جب ڈی ایس پی اس ٹیم کے ساتھ بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچا تو دیوار پر بڑے سرکار کی قد آدم تصویر کو دیکھ کر چونک گیا۔اس کے چہرے پر سوچ نظر آنے لگی تھی۔

”کیا ہوا سر۔“حماد نے اس کو سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں نہ جانے کیوں اس آدمی کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔“

”سر۔اس کا نام تو کوئی نہیں جانتا۔مگر اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔“حماد نے کہا۔

”نہیں۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے برسوں پہلے اس کو دیکھا تھا۔“ڈی ایس پی نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

”ہوسکتا ہے سر آپ نے اس کو کسی کیس میں پکڑا ہو۔“

کیس کی بات سن کر ڈی ایس پی یکدم چونکا اور پھر بولا۔

”میں نے اسکو ادھم پور کے ریلوے اسٹیشن پر ایک بارہ سال کی بچی کے ساتھ گرفتار کیا تھا۔اس نے اُس بچی کو اپنی بیٹی ظاہر کیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات پر بھروسہ نہیں ہوا۔اور اس بچی کو میں نے اپنے بیگم کے حوالے کردیا تھا اور اس کو لاک اپ میں بند کر دیا تھا۔دو تین دن گزرے ہوں گے یہ وہاں سے فرار ہوگیا اور میرے چار جاں نثار پولیس والے بھی مارے گئے۔پھر پراسرار طریقے سے میرے گھر سے وہ بچی بھی۔اس کو ہم نے بہت

ڈھونڈا مگر یہ ملا نہیں۔" ڈی ایس پی نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"سر، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہی وہ پراسرار باس ہو جسکا ذکر درگوش نے کیا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی بچی کو کیوں اغوا کرتا۔" ڈی ایس پی نے سنجیدگی سے کہا۔

"سر، اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔" حماد نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ اسکی بات سن کر ڈی ایس پی پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ چونک کر بولا۔ "فرانزک والوں کو فون کرو اور فنگر پرنٹ والوں کو بھی بلوا لو۔ اور ہاں حماد، تم اس کے بعد ایک اور پولیس پارٹی تیار کرو جو نادر محل میں ریڈ مارے گی۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کی رات اس مورتی کے ڈرامے سے پردہ اُٹھنے والا ہے۔"

"او کے سر۔ لیکن ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ بڑا سرکار خود کہاں ہے جب کہ اس کے ڈیرے پر اتنا بڑا کانڈ ہو گیا۔" حماد نے کہا۔

"معلوم نہیں۔ مگر یہ آدمی مجھے مشکوک لگتا ہے۔" ڈی ایس پی نے بڑے سرکار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

☆......☆......☆

درگوش آندھی اور طوفان کی مانند اپنے فلیٹ پر پہنچا تھا۔ فلیٹ کے دروازے کو دیکھ کر اس نے طویل سانس لی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بہت دنوں کے بعد اس نے اپنے گھر کے دروازے کو دیکھا ہو۔ درگوش نے عجلت میں اپنے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد گیٹ کھل گیا۔

"ارے درگوش بابو آپ۔" اکبر نے اس کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔ "کہاں تھے۔ آپ پولیس

کئی بار آ چکی تھی۔"

درگوش نے اب کی بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔اس کے چہرے پر بدحواسی دیکھ کر اکبر نے دوبارہ سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔ درگوش نے جیسے ہی الماری کھولی مورتی اس کی توقعات کے مطابق اس کے کپڑوں کے ڈھیر پر ہی موجود تھی۔اسے دیکھ کر درگوش نے طویل سانس لی اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"شکر ہے کہ تم مل گئی۔ورنہ وہ لوگ نہ جانے کیا کرتے۔" اتنا کہہ کر اس نے مورتی اُٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لی۔

درگوش کا رخ اب نادر محل کی طرف تھا جہاں اس کی طوسیہ کو انہوں نے قیدی بنا رکھا تھا۔ کافی دیر تک موٹر سائیکل چلانے کے بعد بالآخر وہ نادر محل تک پہنچ گیا تھا۔نادر محل کے گیٹ پر اس کو دو نقاب پوش کھڑے نظر آئے تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

"مسٹر درگوش! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔مورتی لائے ہیں۔" ایک نقاب پوش نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔درگوش کو نہ جانے کیوں اس کی آواز جانی پہچانی لگی تھی۔

"ہاں لایا ہوں مگر پہلے طوسیہ پھر وہ مورتی۔" درگوش نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے چمڑے کے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" ایک نے ہنس کر کہا۔ "چلیں ہمارے ساتھ۔" اس نے درگوش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔درگوش نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ہال نما کمرے میں موجود تھے جہاں چار لوگ اور بھی تھے۔وہ بھی نقابوں میں تھے۔

"خوش آمدید مسٹر درگوش۔"

درگوش نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ آواز اسے دیواروں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کون ہو تم، سامنے آؤ۔'' درگوش نے کڑک کر کہا۔

''ضرور۔ تمہارے سامنے آؤں گا کیونکہ تم نے مجھے پریشان بھی کیا ہے اور میری مدد بھی۔'' آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔

''سامنے تو آؤ میں بھی تو دیکھوں وہ کون ہے جس کی میں نے مدد کی ہے۔''

''تمہارا دل تو نہیں پھٹے گا ناں۔'' آواز طنز سے بھرپور تھی۔

''ہرگز نہیں۔ اس سینے میں فولاد کا دل ہے۔''

''خوب۔ میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔''

درگوش نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایگ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس نئی اور عجیب صورت حال میں وہ کیا کرے۔ اسی لمحے دیوار شق ہو گئی اور جو اس دیوار میں ایک راستہ نظر آ رہا تھا اسی راستے سے جو سب سے پہلے برآمد ہوا تھا وہ طوسیہ تھی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ پشت پر ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے اور وہ رسی ایک نقاب پوش کے ہاتھ میں تھی جو کہ سرتاپا سیاہ تھا۔

''مورتی میرے حوالے کر دو۔'' بیٹھی ہوئی آواز درگوش کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ضرور۔ مگر پہلے طوسیہ۔'' درگوش نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت جیب میں رکھے ریوالور پر سخت ہو گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی ہوشیاری کی تو اس کو گولی مار دے گا۔ نقاب پوش شاید دماغ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ فوراً ہی بولا۔

''اپنا ریوالور نکال کر میرے ساتھیوں کے حوالے کر دو ورنہ جب تک تم اسلحہ یوز کرو گے

میری گولی اس لڑکی کا کام تمام کردے گی۔"

مجبوراً درگوش نے اپنی گن نکال کر سامنے والے ایک نقاب پوش کو دے دی تھی۔

"الو کے پٹھو۔کیا اس کی تلاشی نہیں لی تھی۔" نقاب پوش اپنے ساتھیوں پر دھاڑا۔

"باس۔غلطی ہوگئی۔" ایک نقاب پوش گڑگڑایا۔

"جیک! تم ناگر سے بھی زیادہ نکمے ثابت ہورہے ہو۔ایسی غلطی دوبارہ ہوئی تو ناگر کے پاس پہنچا دیے جاؤ گے۔"

"ہاں تو مسٹر درگوش۔اب یہ بیگ میرے حوالے کردو۔" نقاب پوش اپنے ساتھیوں سے نمٹنے کے بعد درگوش مخاطب ہوا۔

"نہیں، پہلے میری طوسیہ کو میرے حوالے کرو۔"

"نہیں تم شرط رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔تم بیگ اچھالو میں لڑکی چھوڑتا ہوں۔" نقاب پوش نے سفا کی سے کہا۔

درگوش یہاں بھی بے بس تھا۔اس نے وہی کیا جو نقاب پوش نے کہا تھا۔بیگ لیتے ہی نقاب پوش نے طوسیہ کو دھکا دیا تھا۔طوسیہ سیدھی درگوش کی بانہوں میں آگری تھی۔درگوش نے فوراً ہی طوسیہ کو سنبھال لیا تھا اور اس کی پٹی اور ہاتھ کھول دیے تھے۔پٹی اترتے ہی طوسیہ نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے درگوش کو دیکھا تھا۔

"مورتی تو مجھے مل گئی اب میں چاہتا ہوں کہ تم کو ختم کردوں مسٹر درگوش مگر اس سے پہلے میں تمہاری ساری الجھنیں دور کردوں۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب نوچ پھینکا تھا۔

نقاب سے جو صورت باہر آئی، اس کو دیکھ کر درگوش چونک اٹھا تھا جبکہ طوسیہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔جیک اور دوسرے نقاب پوش بھی حیرت میں پڑ گئے تھے۔وہ سوچ بھی نہیں سکتے

تھے یہ آدمی انکا باس ہو سکتا ہے۔

"بابا! آپ۔" طوسیہ چلائی۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا بڑے سرکار کہ تم ہی باس ہو۔ لعنت ہے تم پر جس کو بیٹی کہتے ہو، اسی کو اغوا کیا۔"

"یہ میری بیٹی نہیں ہے اور میرا نام مانینی ہے۔ اس لڑکی سے تو میں بہت پیار کرتا ہوں ساری زندگی اسی سے پیار کیا۔" بڑے سرکار نے ہنس کر کہا۔

"کیا۔" اب حیرت کی باری درگوش کی تھی۔

"ہاں۔ میری محبت اس سے بارہ سال پرانی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تم میرے باپ نہیں ہو۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہاری نظر مجھ پر ہے جبھی اکثر تمہاری نظروں پر میں الجھ جاتی تھی۔" طوسیہ نے غصہ اور دکھ سے کہا۔

"یہ بکواس نہیں۔ یہ کہانی بارہ سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ جب تم پیدا ہوئی تو تمہاری ماں چل بسی۔ تمہاری دیکھ بھال میرے ذمہ لگادی گئی۔ تمہارا باپ جو کہ گاماساں کا نیک دل حکمران تھا، مجھ پر بے حد بھروسہ کرتا تھا۔ تم پیدا ہوئی تو بے حد حسین تھی۔ اسی وقت ہی مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تم بڑی ہو جاؤ گی تو تم کو اپنی بیوی بناؤں گا۔ تمہاری پیٹھ پر ایک خاص نشان بنایا گیا۔ وہ نشان ہمیشہ ہی سے اس قبیلے کے حکمرانوں اور ان کی اولادوں کے جسم پر بنایا جاتا ہے تاکہ بعد میں حکمرانی انہی کو مل سکے۔ یہ گاماساں کی صدیوں پرانی روایت ہے تمہارے بازو پر مقدس اناتھا کو بازو بند سے جڑ کر باندھ دیا گیا۔ وہ تمہارا محافظ تھا۔ پھر گاماساں قبیلے میں بغاوت نے جنم لیا تمہارا باپ سردار لاسا اپنے نائب کی

سازشوں کے آگے ٹک نہ سکا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس کی حکومت زیادہ نہیں ٹکے گی تو اس نے مجھے جنگل والے قلعے میں جانے کا حکم دیا تا کہ وہ اس قلعے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھپ کر اس بغاوت سے لڑ سکے۔ لیکن اس غریب کو موقع ہی نہ مل سکا۔ ایک رات یوکاش نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملہ کر کے تمہارے نہتے باپ کو گھیر لیا۔ جب تک وہ اس تک پہنچتے اس نے تمہیں تمہارے پالتو گھوڑے پر سوار کر کے وہاں سے بھگا دیا۔ لیکن یوکاش کے ساتھیوں نے دیکھ لیا۔ اس نے گھوڑے اور تم کو شدید زخمی کر دیا لیکن وہ بے زبان جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہارے بازو پر بندھا ہوا مقدس اناتھا وہ اس قبیلے میں ہی رہ گیا۔ اور اناتھا کے سبب ہی وہ گھوڑا جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ تم جب میرے پاس پہنچی تو اناتھا تمہارے بازو پر نہیں تھا۔ میں تم کو وہاں سے لے کر فرار ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھو۔ وہاں سے فرار ہونے کے بعد میں ریلوے پلیٹ فارم پر پکڑا گیا اور پولیس نے مجھے بچی کے اغوا کے جرم میں گرفتار کر لیا پھر میں چار پولیس والوں کو مار کر وہاں سے فرار ہو گیا اور تم کو لے کر دیونگر آ گیا۔ زندگی گزارنے کے لئے میں نے منشیات فروشی، اسمگلنگ اور دیگر جرائم کا سہارا لیا اور بڑا آدمی بن گیا۔ ہاشم دارا میرے ہی کہنے پر لڑکیاں اغوا کرتا اور ان کو بیرون ملک فروخت کر دیتا اور وہ گھنٹی کی آواز جو ایک بار تم نے اور طوسیہ نے سنی تھی وہ اس بات کا اشارہ تھی کہ نئی لڑکیاں آ چکی ہیں۔ یہ سارا کام ہاشم کے سپرد تھا۔ وہی اس کی نگرانی کرتا تھا لیکن وہ ایک بے وقوفی کے سبب پکڑا گیا۔ اس نے اپنی اغوا کی ہوئی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی اور اسکو مار ڈالا۔ انسپکٹر جبران نے ہی اس کو گرفتار کیا تھا پھر جبران سے بدلہ لینے کے لئے میں نے جیولری اسٹور لوٹنے کا پلان بنایا اور میں کامیاب ہوا اور جبران میرے ہاتھوں مارا گیا۔“

''جبران کو تم نے مارا۔'' درگوش نے چلا کر کہا۔

''صبر۔کہانی ختم نہیں ہوئی۔ جبران کو تو مرنا ہی تھا یہ دنیا فرض شناسوں اور ایمانداروں کے لئے نہیں۔ ہاشم دارا کو بھی مجھے مروانا پڑا کیونکہ وہ پولیس کی نظروں میں آچکا تھا۔اس کو تمہارے ذریعے چھڑوانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کو جیل میں سچ کی الٹی نہ ہو جائے۔ پھر گاماساں میں جو میرے وفادار تھے وہ اناتھا کو مسلسل ڈھونڈ رہے تھے۔ایک روز وہ انہیں مقدس مندر میں مل گیا جہاں اناتھا طوسیہ سے جدا ہونے کے بعد از خود پہنچ گیا تھا۔ جب بھی کوئی محافظ اپنے آقا سے جدا ہوگا تو از خود اسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں سے وہ لایا گیا تھا۔ پھر اس کو وہاں سے وہی ہلا سکتا ہے جس کا وہ محافظ ہے۔ میرے ساتھیوں نے اناتھا کو وہاں سے ہلا تو دیا لیکن اناتھا غصہ میں آچکا تھا۔ جب اناتھا کو لانچ کے ذریعے سے اسمگل کر کے لایا گیا تو اس کو پہلی بار تم نے چھوا۔طوسیہ کے جسم کی خوشبو تمہارے اندر موجود تھی۔اس کو سونگھ کر اس نے تم کو کچھ نہ کہا مگر اس کی قوتیں مسلسل طوسیہ کو ڈھونڈتی رہیں اور مندر سے ہٹانے کے جرم میں وہ بے گناہوں انسانوں کی بھینٹ لیتا رہا۔ جنہوں نے اس کو مندر سے ہٹایا اور جس لانچ کے ذریعے وہ لایا گیا وہ سب کے سب مارے گئے۔ لانچ والا لانچ سمیت سمندر میں غرق ہوگیا اور وہ میرے ساتھی جنہوں نے اناتھا کو وہاں سے ہٹایا تھا پراسرار طور پر مارے گئے۔اور اب وہ میرے پاس ہے۔'' بڑے سرکار نے طویل سانس لے کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم نہایت ہی نیچ انسان ہو بڑے سرکار۔مگر میری الجھن ابھی دور نہیں ہوئی کہ تم اناتھا کو کیوں ڈھونڈ رہے تھے۔'' درگوش نے کہا۔

''اچھا سوال ہے۔'' بڑے سرکار نے مسکرا کر کہا۔''میں اس مقدس سانپ کی مدد سے دوبارہ جوانی حاصل کروں گا۔طوسیہ جس کا اصل نام عرشی ہے میں اس سے شادی کروں گا۔

گاماساں کا وہ خزانہ جس کی قیمت تقریباً دس کروڑ روپے ہے جو اس کے باپ نے بغاوت کے خوف سے کہیں چھپا دیا تھا اس کو ڈھونڈوں گا اور چین کی زندگی گزاروں گا۔‘‘ اس نے سفاکی سے کہا۔

’’میں تم سے نفرت کرتی ہوں بڑے سرکار۔‘‘ طوسیہ نے حقارت سے کہا۔ اس کی بات سن کر بڑے سرکار کی آنکھوں میں کرب سا نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں پرسکون ہوگئیں۔

’’جب تک میرے پاس یہ ہے۔ تمہاری نفرت محبت میں بدل جائے گی۔‘‘ اس نے مورتی بیگ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ اتنا کہہ کر اس نے بیگ سے اس سانپ کی مورتی کو نکال لیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

’’زامبوز گاشالی۔ امبالاش۔‘‘ بڑے سرکار نے لایعنی قسم کے الفاظ استعمال کئے شاید یہ اناتھا کو مخاطب کرنے کا طریقہ تھا پھر وہ بڑے ہی پیار سے بولا۔

’’اے مقدس اناتھا! میں تجھے تیری مالک طوسیہ کے نام پر حکم دیتا ہوں کہ ان سب کو مار دے۔ یہ سارے تیری طوسیہ کے دشمن ہیں اور درگوش تیری طوسیہ کو مارنا چاہتا ہے۔‘‘ بڑے سرکار نے اس مورتی کو چوم کر کہا۔

پھر دوسرے ہی لمحے سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ بڑے سرکار کے ہاتھ میں ایک زندہ سنہرا سانپ بل کھا رہا تھا۔ پھر وہ ہوا جو کسی نے سوچا نہ تھا۔ اس نے اناتھا کو اپنے ساتھیوں کی سمت اچھال دیا تھا۔ اس کے ساتھی اس افتاد سے بوکھلا گئے اور یہاں وہاں بھاگنے لگے تھے۔ ایک نے فائر بھی کھول دیا تھا مگر اناتھا نے ان کو موقع ہی نہیں دیا تھا۔

درگوش اور طوسیہ نے حیرت انگیز منظر دیکھا جبکہ اور اس کے تمام ساتھیوں کی چلانے کی آوازیں بڑی ہی دلدوز تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے اناتھا کی سفاکی کا شکار ہو گئے

تھے۔ان کی نیلی لاشیں ان کی وفاداری کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔بڑے سرکار کے چھت شگاف قہقہے پورے ہال میں گونج رہے تھے۔اب وہ سانپ قہر برساتا ہوا درگوش کی جانب بڑھ رہا تھا۔طوسیہ بھتری یہ سب دیکھ رہی تھی۔اس سانپ اور درگوش کے درمیان کا فاصلہ کم ہی ہوتا جارہا تھا۔پھر جو ہوا وہ بڑے سرکار نے سوچا ہی نہ تھا۔

☆......☆......☆

درگوش اوراس سانپ کے درمیان طوسیہ آگئی تھی۔اناتھا طوسیہ کو دیکھ کراسی جگہ رک گیا اس نے اپنا پھن زمین سے لگالیا تھا۔

''زامبوزگاشالی۔امبالاش۔اے میرے مقدس محافظ یہ میرادشمن نہیں ہے۔یہ میرا آقا ہے۔میرادشمن وہ ہے۔''اس نے بڑے سرکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اب سانپ کا رخ بڑے سرکار کی طرف ہوگیا تھا۔وہ تیزی سے رینگتا ہو بڑے سرکار کی جانب ہی بڑھ رہا تھا۔

''یہ کیا کررہی ہوتم۔''وہ چلایا۔

''میں تم سے نفرت کرتی ہوں نفرت۔صرف نفرت۔''طوسیہ نے حقارت سے کہا۔درگوش نے دیکھا کہ یہ سب سننے کے بعد بڑے سرکار کے چہرے پر قبرستان کا ساسناٹا چھا گیا تھا۔اس سناٹے کو وہ سمجھتا تھا۔ایسا سناٹا تب پیدا ہوتا ہے جب سب برباد ہوجائے۔

''طوسیہ۔اناتھا سے کہو۔اس کومت مارے۔''درگوش نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''مگر کیوں۔''

''میں نے کہاناں۔یہ اپنی سزا قانون سے حاصل کرے گا۔ذلت اور رسوائی اس کا مقدر ہے۔''

’’اچھا۔‘‘ طوسیہ نے مردنی سے کہا۔ پھر اس نے اناتھا کو روک دیا تھا۔ اناتھا واپس مورتی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بڑے سرکار نے چونک کر ان دونوں کی جانب دیکھا تھا۔ پھر اسی لمحے پولیس کے جوان اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کی سربراہی ڈی ایس پی کر رہا تھا۔ اس نے بڑے سرکار کو گھٹنوں کے بل جھکے دیکھا اور اس کے چار ساتھیوں کی لاشیں بھی دیکھی تھیں۔ بڑے سرکار کی آنکھوں میں عجیب سا سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جو طوفان آنے سے قبل ہوتا ہے۔

’’تم۔ آخر تم بارہ برس بعد مل ہی گئے۔‘‘ ڈی ایس پی نے مسکرا کر بڑے سرکار سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اتنا کہہ کر وہ طوسیہ اور درگوش کی جانب بڑھ گیا جبکہ حماد ان لاشوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسی لمحے ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ آواز بڑے سرکار کی طرف سے آئی تھی۔

سب نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا جو کہ زمین پر پھیل چکا تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی سب ہی اس کی جانب بڑھے تھے۔

’’مم۔ میں طوسیہ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت نہ کرو۔ محبت تو نہ عمر دیکھتی ہے نہ ذات۔ تم میرے قریب تھی تو دل کو سکون تھا۔ تمہارے بغیر یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ جب تک زندہ رہا تمہاری محبت میں اب مروں گا تو تمہاری ہی مح۔۔۔‘‘ بڑے سرکار اپنی بات مکمل نہ کر سکا اور اسکی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔

طوسیہ سمیت سب لوگ اس لاش کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر شاید درگوش کی نظروں میں ہمدردی تھی۔ وہ جانتا تھا محبت کرنے والوں کی نظر میں رائٹ اور رونگ کچھ نہیں ہوتا۔ بس ہوتی ہے تو صرف محبت۔ درگوش کی نظریں ان بے نور آنکھوں پر تھیں جو اَب بھی طوسیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید مرنے سے پہلے وہ طوسیہ کے سراپے کو اپنی نگاہوں میں قید

کر لینا چاہتا تھا۔نہ جانے کیوں درگوش کا دل اداس سا ہو گیا تھا۔محبت کرنے والوں کے یہاں ایسے انجام کی ریت پرانی ہے۔

''طوسیہ! اب تم اناتھا کو واپسی کا حکم دے دو۔'' درگوش نے طوسیہ سے کہا۔نہ جانے کیوں بڑے سرکار کی لاش دیکھ کر اس کا دل رنجیدہ ہو گیا تھا۔

طوسیہ آگے بڑھی اور مورتی کو بیگ میں ڈال کر سرگوشی کی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔چند ہی لمحات کے بعد سب نے بیگ کھولا تو اناتھا اس میں نہیں تھا۔غلام نے اپنے آقا کا حکم مان لیا تھا اور وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

ختم شد